chapter-3

باب سوم

ساحر کی سوانح اور شخصیت

لدھیانہ پنجاب کا بہت ہی معروف اور صنعتی شہر ہے۔ لودھیوں کا آباد کیا ہوا یہ شہر جو کثرت استعمال سے لدھیانہ ہو گیا، عہد جاگیرداری میں چودھری فضل محمد ذیل دار اسی شہر کے ایک علاقے لوڈھوال[1] کے جاگیر دار تھے اور اسی ناطے سے ان کا رتبہ اور شہر و گرد و نواح کے علاقوں میں تھا لیکن اس اقتدار و اعتبار کے باوجود وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے چنانچہ اولادِ نرینہ کی خواہش میں اور جاگیر و جائیداد کے وارث کی تمنا میں انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ سردار بیگم ان کی گیارھویں بیوی تھیں۔ ان کے بطن سے ۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو اولادِ نرینہ کا جنم ہوا جس نے عبدالحئی نام پایا۔ اولادِ نرینہ کی اس خواہش میں سردار بیگم نے متعدد و مختلف خانقاہوں اور درگاہوں میں حاضری بھی دی اور ان کی زیارت بھی کی۔ ان میں درگاہ حضرت صابر کلیری کا، رحمٰن نیر مدیر بیسویں صدی نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے[2]، اور عبدالحئی نام رکھنے سے متعلق روزنامہ امروز لاہور کے مدیر حمید اختر (جو نہ صرف ساحر کے ہم مکتب، ہم جماعت اور گہرے دوست ہی تھے بلکہ ان سے گھریلو مراسم اور ذاتی تعلقات بھی تھے) ساحر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جب ساحر پیدا ہوا تو فضل ذیل دار (ساحر کے والد)
اور ان کے پڑوسی میاں عبدالغنی[3] (جو بعد میں مغربی پنجاب کے وزیر تعلیم بنے)

---

[1] بحوالہ انوارِ ادب: فصیح احمد صدیقی ص ۲۰۳

[2] گوشۂ ساحر لدھیانوی، ماہنامہ بیسویں صدی دہلی، دسمبر ۱۹۸۱ء ص

[3] کتابت کی غلطی کے سبب عبدالحئی کی جگہ عبدالغنی چھپ گیا ہے۔

کے درمیان مقدمہ بازی زوروں پر تھی۔ اس کے والد
نے ساحر کا نام عبدالحئی رکھا اور اس کی پیدائش کے
بعد اس کا قول تھا کہ شام کو گلی میں کرسی بچھا کر نوکروں
اور پڑوسیوں کی موجودگی میں عبدالحئی کو بآواز بلند گندی
اور فحش گالیاں دیتا تھا۔ میاں عبدالحئی اور ان کے
حواری، جو پڑوسی تھے، اعتراض کرتے تو وہ بڑے اطمینان
سے جواب دیتے، میں تو اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے سے
پیار کی باتیں کر رہا ہوں۔[۵۴]

اس بیان کی تصدیق سورج سنیم کے مضمون[۵۵] سے بھی ہوتی ہے، میاں عبدالحئی کے ساتھ فضل محمد ذیل دار کی یہ رقابت اگرچہ ذاتی نوعیت کی تھی لیکن اس کے درپردہ وہی جاگیر دارانہ ذہنیت کارفرما تھی جس نے روایتی طور پر طبقاتی برتری کے احساس کو جلا بخشی تھی اور طبقاتی برتری کا یہی وہ احساس تھا جو فضل محمد ذیل دار اور سردار بیگم کے مابین اختلافات و کشیدگی کا موجب ہوا۔

سردار بیگم کشمیری النسل تھیں لیکن نہ تو جاگیر دارانہ ماحول کی پروردہ تھیں اور نہ اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے چودھری صاحب ایک طرف تو اس شادی کو راز میں رکھنے پر مصر تھے اور دوسری طرف ان کو سماجی حیثیت اور ان کا جائز مقام بھی دینے سے گریزاں تھے۔ سردار بیگم کے لیے یہ اقدامات نہ صرف ایک عورت کے تقدس کی پامالی اور بے عزتی کا سبب ہو سکتے تھے بلکہ سماجی سطح پر ان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کافی تھے چنانچہ ان کا استدلال تھا کہ "رشتہ ہوا ہے تو اس کا برملا اعلان بھی ہو"[۵۶] لیکن چودھری فضل محمد ذیل دار نے اس رشتے کے برملا اظہار سے یوں بھی دامن بچایا کہ ان کے خیال میں ان کا سماجی وقار مجروح ہوتا تھا چنانچہ بیوی ہونے کے ناطے سردار بیگم نے شوہر کی

۵۴ میرا دوست، ساحر لدھیانوی مشمولہ فلمی ستارے دہلی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۷
۵۵ انگریزی مضمون مشمولہ فلم فیئر بمبئی اگست ۱۶ تا ۳۱، ۱۹۸۵ء ص ۷۷
۵۶ ساحر لدھیانوی: ایک مطالعہ مرتب تنویر سعیدی ص ۱۹

اس چشم پوشی کی نہ صرف مذمت کی بلکہ جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے دنیا کے سامنے واضح طور پر بیوی کا درجہ دینے کے لیے انھیں مجبور بھی کیا۔ لیکن چودھری فضل محمد ذیل دار اپنے سماجی اعتبار کے زعم میں، سردار بیگم کو تمام اخراجات اور تمام تر مادی سہولتیں فراہم کرنے کو تو تیار تھے مگر ان کو اپنے ہم پلہ تصور نہ کرنے کے سبب سماجی سطح پر علی الاعلان بیوی کا درجہ اور حق دینے کے لیے کسی بھی صورت سے راضی نہ ہوئے۔

ساحر کی ولادت کے بعد ان کی والدہ سردار بیگم کو اور بھی تشویش ہوئی چنانچہ ان کا اصرار اور بھی بڑھا لیکن چودھری صاحب پر جاگیر دارانہ وقار کا بھوت اس طرح سوار تھا کہ وہ اس سطح پر آنے میں اپنی توہین محسوس کرتے تھے۔ انھیں اپنی بیوی اور اپنے اس بیٹے کا، جو اتنی منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اتنا خیال نہ تھا جتنا اپنے سماجی مرتبے کا، اپنی طبقاتی برتری اور جھوٹی شان کا، بلکہ ان کا خیال اس حد تک خطرناک تھا کہ اہلِ دنیا کا بھرم رکھنے کو تو اہمیت دیتے تھے لیکن اپنی بیوی کو سماجی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ تھے کہ لوگ اس شادی کا مذاق اڑائیں گے۔ اب تک دستیاب ہوئے تحقیقی مواد اور حاصل ہوئی شہادتوں سے انہی امر کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ یہ روایت شکل بدل بدل کر ہر دور میں زندہ رہی ہے اور آج اس عہد میں بھی، جب کہ نت نئے سائنسی انکشافات نے اذہانِ انسانی کو جدید تحقیقی رویوں سے ہم کنار کیا ہے۔ لیکن یہی روایتی مگر فرسودہ قدریں عصری سماج کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ (ساحر نے اپنی متعدد نظموں کے ذریعے اس خیال اور اس روایت کی مذمت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس احساس پر اظہارِ تاسف بھی کیا ہے اور اس جذبے کو حرفِ ملامت بھی بنایا ہے)[۷]

[۷] مثال کے طور پر شہکار، کسی کو اداس دیکھ کر، مرے گیت، کچھ باتیں، شہزادے، خودکشی سے پہلے اور جاگیر وغیرہ ساحر کی ایسی نظمیں ہیں جن میں نہ صرف امارت کے تکبر کا ہی تمسخر اڑایا گیا ہے بلکہ فرسودہ روایتوں پر بھی گہرا طنز ملتا ہے۔

سردار بیگم نے (اس کے باوجود کہ چودھری صاحب نے اپنے خود ساختہ اور جھوٹے سماجی وقار کو فوقیت دی) اپنے بیٹے کے مستقبل کی خاطر اپنے شوہر پر دباؤ ڈالا اور انھیں مجبور کیا، اپنے اس اکلوتے بیٹے کا واسطہ دیا جس کی خواہش میں انھوں نے متعدد شادیاں کی تھیں، تاہم انھوں نے اپنا رویہ ترک نہ کیا۔ چودھری صاحب کے ان منفی رویوں کی ایک وجہ ان کی الجھن اور پریشانی بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ ایک طرف تو جاگیر داریت مائل بہ زوال تھی اور کسانوں اور مزدوروں پر سے گرفت بھی ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور دوسری طرف وہ تمام مقدمہ بازیاں جن کی جانب حمید اختر[۵۸] نے اشارہ کیا ہے اور پھر متعدد شادیوں کے اخراجات جو جاگیریں بیچ بیچ کر پورے ہو رہے تھے نیز جدید اور اعلا تعلیم سے انحراف کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل اور شکست خوردگی کا شدید احساس بھی اثر انداز ہو رہا تھا جس کی وجہ سے آگے چل کر بیٹے سے بھی ہاتھ دھونا پڑا (اس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا) ان سب مسائل نے یکجا ہو کر نہ صرف ان کی سوچ ہی محدود کر دی بلکہ ترقی کے مواقع بھی ہاتھ سے جاتے رہے گویا ع نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کے مصداق رفتہ رفتہ ان مسائل و معاملات کی گرفت ان پر اتنی مضبوط ہوتی گئی کہ انھیں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر غور کرنے اور کسی دوسری طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا اس طرح یہ معاملہ روز بہ روز طول پکڑتا گیا چنانچہ سردار بیگم کا اصرار جس قدر بڑھتا گیا ان کے شوہر کا اخلاقی کردار اسی قدر گھٹتا اور گرتا گیا۔

۵۸ "اس کا باپ ایک روایتی زمیں دار تھا جو اپنی زمینوں کے قطعات بیچ بیچ کر شادیاں کرتا تھا۔ مقدمہ بازی اس کی زندگی کا لازمی حصہ تھا۔"

مضمون، میرا دوست: ساحر لدھیانوی مشمولہ ماہنامہ فلمی ستارے، دہلی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۷

اس کے باوجود شوہر کو راہِ راست پر لانے اور ان کو ان کے فرائض کا احساس دلانے کی ان کی کوششوں میں فرق نہ آیا لیکن جب اپنی اس حتی الوسع جدوجہد کے باوجود وہ ناکام رہیں تو شوہر کی بے اعتنائی و عدم توجہی سے تنگ آکر اپنے اور اپنے بیٹے کے حقوق کی بحالی اور مستقبل کے تحفظ کی خاطر اپنے شوہر کے خلاف "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کے مصداق، وہ عدلیہ کی مدد لینے پر مجبور ہوگئیں۔ گوپال متل اور ایم ڈبلیو فاروقی کے حوالے سے، جو ساحر سے قریبی تعلق رکھتے تھے، مخمور سعیدی کا بیان ہے کہ:

"ان کی (چودھری فضل محمد ذیل دار) یہ ضد ساحر کی والدہ اور خود ساحر کو سماج اور قانون دونوں کی نظر میں بے وقعت کر دینے کے مترادف تھی اس لیے سردار بیگم نے اپنے ضدی شوہر سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا اور ..... عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔"[۹]

اس قانونی چارہ جوئی کے سلسلے میں جیسا کہ عرض کیا گیا وہ غیر معمولی اسباب تھے جو ماں اور بیٹے دونوں کو سماجی حیثیت سے بے وقعت اور قانونی حیثیت سے بے حیثیت کر دینے کے لیے کافی تھے ان اسباب کا ایک اضافی اور اہم پہلو یہ بھی تھا کہ چودھری صاحب محض اپنی عیش کوشی اور اپنے جاگیرداری وقار[۱۰] کے بھرم کی خاطر موروثی جاگیریں، اور زمینیں کوڑیوں کے مول غیر قانونی طریقے سے فروخت کرنے لگے تھے۔ ان کا یہ اقدام سردار بیگم کے لیے مزید تشویش کا سبب بنا کہ اس منفی رویے سے تو ان جاگیروں کا وارث نہ صرف بے یار و مددگار ہوگا بلکہ اس کا سماجی اعتبار بھی جاتا رہے گا۔

۹ ساحر لدھیانوی: ایک مطالعہ مرتب مخمور سعیدی ص ۱۹

۱۰ ساحر کی نظمیں جاگیر، شہزادے، تاج محل، مجھے سوچنے دو، نوجہاں کے مزار پر کم و بیش اسی احساس اور جھنجلاہٹ کی ترجمان اور جاگیردارانہ مزاج کے خلاف ان کے ردِ عمل کی پہچان ہیں۔

فرسودہ روایتوں کے اس پُر حبس ماحول اور ان سنگین
اور جاں گسل حالات میں[۱۱] اپنے بیٹے کے خوش گوار مستقبل کے تئیں سردار بیگم
کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اسے تعلیم کی طرف راغب کریں کیوں کہ ان کے خیال
میں تعلیم سے بیزاری ہی انسانی قدروں کی پامالی اور سماجی تنزلی کا باعث ہے اور
اخلاقی گراوٹ اور فقدانِ تہذیب انہی جاہلانہ رویوں کی دین ہے چنانچہ ساحر جب
اس عمر کو پہنچے تو انھیں مالوہ خالصہ اسکول، لدھیانہ میں، جو گھر سے قریب بھی تھا، داخل
کرا دیا۔ گھر سے قریب رکھنے کی ایک اہم وجہ ان کی نگہداشت بھی تھی کیوں کہ مقدموں
کے ابتدائی فیصلے جب سردار بیگم کے حق میں ہونے لگے تو چودھری صاحب کو یہ فکر لاحق
ہوئی کہ مبادا مجھے اپنی جاگیر و میراث سے دست بردار نہ ہونا پڑے اور دوسری طرف
محترمہ ناز صدیقی کے بیان کے مطابق ان مقدموں کی وجہ سے وہ لوگ بھی دشمن بن گئے
جنھوں نے ناجائز طور پر زمینیں خریدی تھیں۔ ساحر کی والدہ کو خوف تھا کہ کہیں
بیٹے کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے اس لیے وہ انھیں گھر سے نکلنے نہیں دیتی تھیں[۱۲]
اس احساسِ تفکر نے سردار بیگم کو اور زیادہ مشوش کیا، یہی سبب تھا کہ وہ اپنے
بیٹے کو قریبی اسکول میں داخل کرانے پر مجبور ہوئیں۔ اُدھر چودھری صاحب جو جاگیرداری
کی فرسودہ روایات و باقیات سے چمٹے ہوئے تھے، اپنی حد الٰہی شکست سے گھبرا کر
اس منصوبے کے تحت مذہب کا سہارا لیا اور منصف کے سامنے دعویٰ پیش کیا کہ
نہ صرف شرعی حیثیت سے ہی بیٹے پر باپ کا زیادہ حق ہوتا ہے بلکہ قانونی طور پر بھی یہ اختیار
حاصل ہے کہ ایک معینہ مدت کے بعد اپنی تحویل میں لے سکتا ہے۔ اس دوران ایک
دلچسپ بات یہ بھی ہوئی کہ صرف سردار بیگم کے دعوے کو کمزور کرنے کی خاطر چودھری صاحب نے

۱۱؎ اپنے حالات و ماحول کی ان سنگینیوں کا ساحر نے اکثر ذکر کیا ہے اور بالخصوص
یہ شعر تو اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے بھی اس تناؤ کا ترجمان بن گیا ہے ؎

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے؟

۱۲؎ ساحر شخص اور شاعر: ناز صدیقی ص ۱۵

ایک اور شادی اس امید پر کرلی کہ اگر اس سے نرینہ اولاد ہو جائے تو مقدموں کی نوعیت بدل سکتی ہے اور اس صورت میں سردار بیگم بے دست و پا ہو کر مقدمہ بازی سے کنارہ کش ہو سکتی ہیں لیکن اس اضافی شادی اور مذہب کو بنیاد بنا کر کی گئی منصوبہ بندی کے باوجود چودھری صاحب کو ناکامی ہوئی اس طرح ان کا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ساحر ہی تنہا وارث رہے۔ دوسری طرف روایتی سوچ کی بنا پر وہ دولت کو ہی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور تعلیم کی اہمیت سے بھی بے نیاز تھے جب کہ سردار بیگم کا میلان تعلیم کی طرف زیادہ تھا، بالفاظ دیگر چودھری صاحب "حال" کو اہمیت دیتے تھے اور "مستقبل" سے بے خبر، وقتی خوشیوں اور حصولِ زر کو ہی زندگی کا ماحصل تصور کرتے تھے۔ اس کے برعکس سردار بیگم کی نگاہ "حال" سے زیادہ "مستقبل" پر تھی کیوں کہ زندگی کے جن آلام و مصائب سے وہ گزر رہی تھیں اس میں "حال" غیر اہم بن جاتا ہے اور "مستقبل" کی خوش گواری کے امکانات آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔

سردار بیگم کے یہی خیالات و نظریات بالآخر ان کی کامیابی اور ترقی کے ضامن ہوئے جب کہ چودھری صاحب اپنے انہی منفی خیالات کے سبب نہ صرف تنزلی کی طرف مائل ہوئے بلکہ عدالت میں ناکامی سے دوچار بھی ہوئے۔ ناز صدیقی نے اپنی تصنیف میں جو ساحر کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی ہے، چودھری صاحب اور سردار بیگم کے مابین چل رہے مقدمات، دونوں فریقین کے بیانات اور منصف کے فیصلہ کن خیالات پر وضاحت سے روشنی ڈالا ہے، لکھتی ہیں:

> "جب عدالت میں ان سے پوچھا گیا،
> وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو انھوں نے
> (ساحر نے) جواب دیا، وہ اپنی ماں کے پاس ہی
> رہیں گے لیکن قانونی طور پر والد کو یہ حق حاصل
> تھا کہ وہ بیٹے کو اپنے ساتھ رکھیں۔ بیٹے کو ماں کی

سرپرستی میں دینے کی کوئی معقول وجہ درکار
تھی۔ اتفاق سے ان کے والد نے عدالت میں جو
بیان دیا اس سے ان کا ادعا کمزور پڑ گیا ....
پھر جج نے سوال کیا کہ وہ لڑکے کی تعلیم کا
کیا انتظام کریں گے، تو انھوں نے جواب دیا
کہ پڑھائے وہ اولاد کو جس کو نوکری کروانا ہو۔
اللہ کا دیا بہت کچھ ہے وہ بیٹھ کر کھائے گا۔ جج نے
فیصلہ دیا کہ بچے کو ماں کے ساتھ ہی رکھا جائے کیوں کہ
وہ تعلیم دلوا رہی ہیں اگر اس کو والد کے ساتھ رکھا
جائے تو وہ اَن پڑھ رہ جائے گا۔" [۱۳]

ساحر عدالتی فیصلے کے بعد ماں کی سرپرستی اور نگرانی میں آ تو گئے لیکن اس غیر محفوظ ماحول کے سبب ان کی والدہ میں عدم تحفظ اور تشکیک کا احساس اور بھی مستحکم ہوتا گیا جس کا براہِ راست اثر ساحر کی ابتدائی زندگی پر پڑا اور اس کا تاثر تادمِ مرگ قائم رہا نتیجتاً وہ زندگی بھر ان اثرات سے نجات نہ پا سکے۔ سورج نسیم نے، جو فلموں کے تعلق سے ساحر سے بہت قریب رہے ہیں ان اثرات و احساسات کی نشاندہی اور اس کا ذکر بڑے ہی موثر پیرائے میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"These culminated in a court battle. Sahir who was only a child took the side of his mother. His father couldn't bear this and threatened to

[۱۳] ساحر شخص اور شاعر: ناز صدیقی ص ۱۶

either have him kidnapped or killed. His mother had to, therefore, employ security guards to protect him. This caused him to lead a rather sheltered, protected life. He grew up to be suspicious of everyone. Highly insecure, he could never travel alone, not even short distances. He could never trust anyone." ۱۲ھ

عدالتی بیان کے وقت ساحر کی عمر تقریباً دس برس تھی تاہم اس کم سنی میں بھی اپنے والد کے مظالم، والدین کے مابین شدید اختلافات، جاگیرداری سماج کی حد بندیوں اور جاگیرداروں کے جابرانہ رویوں نے ساحر کے احساس پر کاری ضرب لگائی اور ان کے جذبوں کو بری طرح مجروح کر دیا۔ تلخیاں کی کتنی ہی نظمیں ان مجروح جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ کسی کو اداس دیکھ کر کا احساس اور فرار میں گزرے ہوئے ایام سے نفرت کا جذبہ، ساحر کے اسی ردعمل کی غمازی کرتا ہے۔ کیوں کہ ایک طرف اگرچہ والد کے رویۂ بیگانگی نے ان کے جذبۂ تنفر کو ابھارا تھا تو دوسری طرف موجودہ سماج کی فرسودگیوں اور حالات و ماحول کی ستم ظریفیوں نے ان میں پورے جاگیردارانہ سماج سے بیزاری کا احساس بھر دیا تھا اس طرح ان میں نفرت، غم و غصہ، لایقینی اور بزدلی کا احساس بڑھنے لگا، جس کی طرف سورج سنیم نے مندرجہ بالا اقتباس میں اشارہ کیا ہے۔ اس غیر یقینی کے احساس کے ساتھ اور غیر محفوظ ماحول میں ساحر پرورش بھی پاتے رہے اور ان کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۲ھ The heart is a lonely hunter: Suraj Sanim
Film Fare, Bombay, August 16-31, 1985. P. 77

اسکول میں مولانا فیاض ہریانوی[15] کی تربیت میں انھوں نے اردو و فارسی پر اپنی ذہنی گرفت مضبوط کرلی، پنجابی علاقائی اور مادری زبان تھی اور انگریزی زبان و ادب اسکول میں لازمی۔ اس طرح انھیں بہ یک وقت چار زبانوں کی ادبیات کا علم حاصل ہوا۔ مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ چوتھی جماعت میں ہی علامہ اقبال کی بال جبریل اپنے ماموں کے وسیلے سے پوری پڑھ لی تھی[16] آگے چل کر انہی مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ کی تثلیثی قوت نے ان میں چھپے ہوئے شاعر کی رہنمائی کی اور مالوہ خالصہ کالج میں میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات نے شعری پیکر اختیار کرلیا اور معاشی و معاشرتی حالات کی سختیوں اور نجی زندگی کی محرومیوں اور اداسیوں نے ان میں لا اعتمادی کا جو زہر بھر دیا تھا اپنی پوری شدت کے ساتھ تلخیاں کے صفحات پر پھیل گیا۔

اس ضمن میں یہ بات قابلِ لحاظ بھی ہے اور بے مثل بھی کہ عام طور سے مبتدی شعراء، شاعری کا آغاز غزل سے کرتے ہیں اور پھر آگے چل کر اپنی شعری و صنفی سمت کا تعین کرتے ہیں یہ ایک روایتی مگر شعوری عمل بھی ہے لیکن اس کے برخلاف ساحر کی شعر گوئی کا آغاز نظم سے ہوا گو اس سے قبل شعر کہنے کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن باقاعدہ اور باضابطہ غزل کہنے کی طرف رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔ نریش کمار شاد کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور باقاعدہ نظم کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں:

"۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ـــــ

[15] اس زمانہ میں (۱۹۳۷ء) موجودہ ہریانہ، پنجاب میں شامل تھا الگ سے اس کی پہچان نہیں تھی اور یہ انٹرویو قیام ہریانہ کے بعد کا ہے اور عین ممکن ہے کہ مولانا فیاض صاحب موجودہ ہریانہ کے کسی شہر کے رہنے ہوں گے، اسی انٹرویو سے متاثر ہوکر ناز صدیقی نے بھی اپنی تصنیف میں فیاض ہریانوی کا ہی ذکر کیا ہے۔

[16] ماخوذ از فن اور شخصیت، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۶۷-۶۶

جب مجھے بالکل قرأت تھی پہلا شعر کہا تھا۔ یاد نہیں
شاید یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہو ..... میں نے اپنی سب
سے پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ اپنے اسکول کے
ٹیچر فیاض ہریانوی کو ان کی رائے دریافت کرنے کے
بھیجی تو انھوں نے (کہا) ..... کہ اشعار موزوں ہیں
لیکن مجموعی حیثیت سے نظم بہت معمولی ہے .....
میرے لیے اس وقت یہی بہت تھا کہ اشعار موزوں تو
ہیں۔" ۱۷ھ

اشعار کی موزونیت نے کم عمر طالب علم شاعر، ساحر کی شعری صلاحیتوں کو نہ صرف جلا بخشی بلکہ ان کو شعر گوئی کی طرف مائل بھی کیا۔ اس منزل میں روایت کے مطابق تخلص کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نگاہِ انتخاب علامہ اقبال کے لکھے ہوئے مرثیے، مرثیۂ داغ کے اس شعر پر ٹھہری ؎

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی ؎

اور ساحر کے مطابق اپنی شاعری سے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی اور چوں کہ میں بھی اپنے آپ کو سیکڑوں میں ایک شمار کرتا تھا اس لیے اپنے تخلص کے لیے مجھے ساحر مناسب معلوم ہوا ۔ ۱۸ھ اس طرح جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ مگر جاگیردارانہ ماحول کے غیر شریفانہ طور طریقوں اور جاگیرداروں کے جابرانہ رویوں سے متنفر چودھری عبد الحئی، عبد الحئی سے ساحر لدھیانوی ہو کر تاریخِ ادبِ اردو کا ناقابلِ فراموش حصہ بن گئے۔

۱۷ھ ساحر کے ساتھ ایک شام مشمولہ فن اور شخصیت: ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۳
۱۸ھ ایضاً ایضاً ایضاً

میٹرک پاس کر لینے کے بعد ۱۹۳۸ء[۲۰] میں ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانہ
میں منتقل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ملک انگریزی سامراج کے چنگل سے
نجات حاصل کرنے کے لیے متحدہ محاذ کے ساتھ جدوجہد کر رہا تھا نیز دوسری عالمی
جنگ کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے تھے۔ ادھر برطانوی سامراجیت کی بنیادوں
میں تنزلزل آنے کے سبب حکمراں طبقے میں بےچینی کی سی صورت پیدا ہو چلی تھی لیکن
وہ اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر جاگیرداروں اور زمین داروں کی پشت پناہی
بھی کر رہی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جو کہ

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

کے مصداق، آج تک تھکے ہارے، افلاس کے مارے مجبور و بےبس عوام کی
محنت کا استحصال کرتے آئے تھے اور اپنی جاگیر کے تحفظ اور اپنے روایتی مگر فرسودہ
اور استحصالی شان وشوکت کی بقا کی خاطر انگریزوں کی غلامی کر لینے پر بھی آمادہ
اور مجبور تھے یہ[۱۹] ان کا بھرم تھا کہ انگریزی سرکار بہرحال ان کی حمایت کرے گی اور جاگیرداروں کے تئیں
انگریزی حکومت کی بھی یہ مجبوری اور غلط فہمی تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی گرفت آج بھی معصوم عوام
پر مضبوط ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہندستان میں ان کے وفادار ہو سکتے ہیں اور درحقیقت
یہی وہ ماحول تھا جو ساحر کے بچپن کا مقدر بنا کہ ان کے والد جاگیردار اور انگریزوں کے
وفادار، اور یہ تاریخی سچائی ہے کہ انگریزوں کے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے
نظریے اور جاگیرداروں کے اپنی بقا و تحفظ کی خاطر انگریزوں کے تئیں وفاداری کے رویے
کے سبب سے ہی جملہ اقوام ملک عرصۂ دراز تک غلامی کی صعوبتیں اٹھاتے رہے۔
ایسے ظلم پرور اور انسانیت سوز حالات و ماحول سے ساحر ایسے ذکی الحس، جذباتی اور
انسانیت دوست شخص کا بغاوت کر جانا فطری عمل تھا کیوں کہ وہ نہ صرف انگریزوں
کی ان کیادیوں سے ہی واقف تھے بلکہ ہندستان کی سیاسی و اقتصادی غلامی کا اثر پوری
قوم کی تباہی و تنزلی میں دیکھ رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں اگرچہ

۱۹؎ ساحر کی کئی نظموں میں اس نظریہ و عمل کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے اور براہ راست
مذمت کی گئی ہے۔ نظم جاگیر میں رد عمل کی یہ لے اور بھی تیز ہے۔

۲۰؎ جدید شعرائے اردو: مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید ص ۹۷۴

انھوں نے فلسفہ اور فارسی مضامین منتخب کیے تھے[۱۲] لیکن ان کی توجہ کے مرکز علم سیاسیات اور معاشیات ہی رہے۔ اس توجہ اور دلچسپی کا سبب بھی ہندستانی سیاست اور معیشت رہی کیوں کہ ان کے سامنے غلام ہندستان کی غلام انسانیت تھی جو نہ صرف سیاسی اور فکری آزادی سے ہی محروم تھی بلکہ طبقاتی درجہ بندی کے سبب استحصال کا شکار بھی تھی۔ اسی احساس نے ساحر کو ہندستانی سیاست میں عملی طور سے حصہ لینے پر آمادہ کیا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جدوجہدِ آزادی میں اگرچہ مختلف سیاسی جماعتیں برسرِکار اور کسانوں اور مزدوروں کی تنظیمیں شریکِ کار تھیں لیکن طلبہ کی انجمنیں بھی نمایاں کردار ادا کر رہی تھیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی سامراج کے تشدد کو شدت سے محسوس کر رہا تھا دوسرے یہ کہ ان کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا گو یہ طلبہ مختلف سیاسی جماعتوں اور تحریکوں سے نظریاتی طور پر وابستہ تھے لیکن سب کا مطمحِ نظر ایک تھا اور وہ تھا تمام اقوامِ ملک کو غلامی کی قید و بند سے نجات دلانے کا ارمان، لیکن ساحر کے نزدیک اس نجات کا تصور محض سیاسی آزادی تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے ارمانوں کی حدیں اقتصادی آزادی اور فکری آزادی کی سرحدوں سے ملتی تھیں۔ اس زمانے میں جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا، کانگریس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں اور تحریکیں آئینی اور قانونی حدود میں رہ کر اپنے اپنے نظریات کے ساتھ آزادیِ وطن کے لیے سرگرداں تھیں جبکہ طلبہ کی مختلف تنظیمیں، جو مختلف سیاسی جماعتوں سے نظریاتی وابستگی رکھتی تھیں، زیادہ پُرجوش اور جذباتی انداز میں برطانوی استعماریت کے خلاف برسرِپیکار تھیں۔ اسی زمانے میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی طلبہ تنظیم سے

[۱۲] ساحر شخص اور شاعر : ناز صدیقی ص ۱۴

ساحر کے روابط استوار ہوئے۔ یہ تنظیم ۱۹۳۶ء میں ہی وجود میں آچکی تھی جب کہ ساحر مالوہ خالصہ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ کمیونسٹ پارٹی جو مارکسی نظریات کی حامل اور روسی انقلاب سے متاثر تھی، سیاسی و اقتصادی آزادی کے مثبت پہلوؤں پر غور کر کے ایک نئے اور جمہوری نظام کے قیام کے لیے عمل پیرا تھی۔ اس سیاسی جماعت نے مختلف شعبہ ہائے زندگی پر خاصا مثبت اثر ڈالا۔ چنانچہ سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر مختلف انجمنیں اور تحریکیں وجود پذیر ہوئیں۔ اس لحاظ سے ۱۹۳۶ء کا سال ہندستانی سیاست کے لیے خاصا اہم ہو جاتا ہے کیوں کہ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں آیا۔ جو بالترتیب ادبا و شعراء، طلبہ اور کسانوں اور محنت کشوں سے متعلق تھیں۔

ساحر طلبہ کی اسی تنظیم، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے توسط سے ہندستانی سیاست میں عملی طور پر شریک ہوئے اور ادبی و شعری سطح پر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنی فکری و شعری صلاحیتوں کو متوسط اور نچلے طبقوں اور محنت کش عوام کی فلاح و ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ اس طرح انھیں اپنے اُن خیالات و جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ مل گیا جو سامراجی استعماریت کے ساتھ ساتھ خود ان کے اپنے ماحول کے پیدا کردہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے سیاسی جلسوں میں نہ صرف جذباتی تقریروں کے ذریعہ کسانوں کو مزدوروں کو بیدار کرنے اور انگریزی حکومت کے خلاف آمادۂ پیکار ہونے اور اپنی سیاسی نظمیں سنا سنا کر عوام کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا کام کیا بلکہ انسانی عظمت و برتری اور معاشی و معاشرتی بہتری اور سیاسی و فکری آزادی کا احساس بھی جگایا۔ اس طرح وہ بہت جلد بحیثیت سیاسی کارکن گرد و نواح میں مقبول ہو گئے اور اپنی شعری صداقتوں کی بدولت نواحی و علاقائی سرحدوں کو بھی پھلانگ گئے۔ اس کے نقوش ساحر کے اولین مجموعۂ کلام

تلخیاں کی ابتدائی نظموں اور غزلوں میں بہت نمایاں ہیں۔ اس دوران ساحر کی کئی نظمیں ضبط بھی ہوئیں۔ ان ضبط شدہ نظموں میں ایک نظم شعلہ نوائی بھی ہے جو ۱۹۳۹ء میں ہفتہ وار افغان، بمبئی میں شائع ہوئی تھی۔[۲۲] اتنی کم عمری میں بحیثیت شاعر اتنی زیادہ مقبولیت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے لیکن شاعری بہرحال سن و سال کی محتاج نہیں ہوتی اور ساحر بلاشبہ ان چند خوش نصیب لوگوں اور کامیاب شاعروں میں ہیں جن کی شاعری ان کی کم سنی کے باوجود قبول عام کی سند حاصل کر سکی۔ حالانکہ ان کے والد ان تمام سرگرمیوں سے نہ صرف ناخوش تھے بلکہ فکرمند بھی رہتے تھے اور "جب انھیں (یہ) پتہ چلا کہ ساحر زمیں داروں اور جاگیرداروں کے خلاف تقریریں کرتے ہیں تو دکھ کے ساتھ کہنے لگے کہ اللہ نے ایسی اولاد دی کہ باپ کی زمیں داری ختم کرانا چاہتا ہے۔"[۲۳] جب کہ اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ ساحر کی مخاصمت اب نہ تو محض باپ کی زمیں داری سے تھی اور نہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت سے بلکہ ان کی نفرت و بیزاری کا تعلق پورے معاشرتی ڈھانچے، سیاسی نظام اور ان فرسودہ روایتوں اور رواجوں سے تھا جو عام انسانی زندگی کے مصائب و مسائل، ذہنی تعطل، معاشی و معاشرتی انجماد اور فکری انتشار کا ذمہ دار تھا۔

اپنی شعری زندگی کے ابتدائی دور میں ساحر نے اے ایچ ساحر کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور ان نظموں کو اول اول کالج اور بیرونِ کالج کے مشاعروں اور عوامی جلسوں میں سنانے کے بعد بغرضِ اشاعت مختلف رسائل کو بھی بھیجا لیکن یہ نظمیں بوجوہ اشاعت پذیر نہ ہو سکیں۔ ان وجوہات کا ایک

۲۲ ضبط شدہ نظمیں: خلیق انجم، مجتبیٰ حسین ص ۱۷۱
۲۳ ساحر شخص اور شاعر: ناز صدیقی ص ۱۸

سبب کلام کا غیر معیاری ہونا بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ اس وقت کے ہنگامی دور کے پیداوار تھے اور دوسرا مدیران کی مجبوری بھی، کیوں کہ اس انقلابی دور میں حکومت کی طرف سے پریس پر شدت کے ساتھ پابندی لگائی جارہی تھی اور نہ صرف شعراء کی تخلیقات اور ادباء کی تصنیفات ہی ضبط کی جارہی تھیں بلکہ رسائل و جرائد تک پر ان ضابطوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ اور ترقی پسند رجحانات کے نقیب نیا ادب کے شماروں کا جو حشر ہوا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسی ہی نہ جانے کتنی مثالیں ادبی و سیاسی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ البتہ اس زمانے میں کچھ اخبارات ایسے بھی تھے جو انگریزی حکومت کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے لیکن برٹش گورنمنٹ کی پہنچ سے باہر تھے، ایسے ہی ایک اخبار کیرتی لہر کا ذکر کرشن ادیب نے کیا ہے جس میں ساحر کی ابتدائی دور کی انقلابی اور سیاسی نظمیں جو فرنگی سامراجیت سے حقارت اور بغاوت کا اعلان نامہ ہوا کرتی تھیں، شائع ہوئیں (گو یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی نظم کسی مجموعۂ کلام میں شامل ہے یا نہیں۔ نیز کیرتی لہر کی فائل بھی دستیاب نہ ہو سکی کہ اسی کے اوراق کچھ رہنمائی کرتے) کرشن ادیب کا بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے ساحر کی ابتدائی نظموں سے متعلق اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں، رقم طراز ہیں:

> یہ ان دنوں کی بات ہے جب پورے
> ہندستان پر فرنگی سامراج کا تسلط تھا۔۔۔۔۔۔
> اور جدوجہدِ آزادی کا صلہ قید و بند کی صعوبتیں اور
> دار و رسن کے لمبے سلسلے تھے۔ لیکن اس کے باوجود
> نوجوانوں میں آزادی حاصل کرنے کی تڑپ تھی۔ اگرچہ

پریس کی آزادی محدود تھی تاہم ایسے اخبار باقاعدگی سے نکلتے تھے جن کی اشاعت زیرِ زمین ہوتی تھی۔ انہی اخباروں میں ایک اخبار کیرتی لہر ہفتہ وار تھا جو میرٹھ سے چھپ کر دست بدست آتا تھا اس کے مدیر غالباً کامریڈ مبارک ساغر ہوا کرتے تھے ------ منشی احمد دین اور ٹیکارام سخن اس میں خصوصی لکھنے والے تھے۔ انہی دنوں ایک نظم "قسم ان تنگ گلیوں کی جہاں مزدور رہتے ہیں" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ شاعر کا نام تھا اے ایچ ساحر متعلم، گورنمنٹ کالج لدھیانہ۔ نظم سے متاثر ہونا فطری تھا ------ اس کے بعد کیرتی لہر کے ہر شمارے کا اس لیے بھی انتظار رہتا تھا کہ ساحر کی کوئی نئی نظم پڑھنے کو ملے گی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی بہت سی نظمیں مجھے کیرتی لہر کے توسط سے پڑھنے کو ملی تھیں۔ یہ نظمیں ساحر کے کسی بھی شعری مجموعے میں شامل نہ ہو سکیں۔ شاید اس لیے کہ وہ ساحر کی شاعری کا عبوری دور تھا۔ بہرحال ساحر کا شعری لہجہ مکمل باغیانہ تھا جو آنے والے دور میں ساحر کے عوامی شاعر بننے کی نشاندہی کرتا تھا۔ ۲۴

۲۴ ساحر یادوں کے آئینے میں: کرشن ادیب ص ۲۶-۲۵

کرشن ادیب کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ ہر وہ ذی ہوش جس کے دل میں انسانیت کا درد موجود ہو اور جو مجبور و بے بس عوام کے تئیں ہم دردی کا جذبہ رکھتا ہو، ہر ظلم اور ناانصافی کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو سکتا ہے خواہ وہ خاندانی روایت و وراثت کا حصہ ہو یا سیاسی و سماجی نظام کا پیدا کردہ۔ ساحر کی نجی زندگی جن مصائب و ابتلا کا شکار رہی وہ اگرچہ ان کے خاندانی ماحول کے غیر متوازن ہونے کا نتیجہ تھی جس کے سبب ساحر والد کا در چھوڑ اپنی نانی کے گھر پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اس پر اس وقت کے روایتی جاگیرداری نظام اور فرسودہ اقدار تہذیب کی گہری چھاپ تھی اور اب مسئلہ صرف ساحر کی انفرادی زندگی کا نہیں تھا بلکہ اجتماعی زندگی کی محرومیوں اور نا آسودگیوں کا تھا اور ساحر چوں کہ فطری طور پر انسانی قدروں کے پاس دار تھے اور انسانیت کا درد محسوس کرتے تھے چنانچہ ان کا یہ احتجاجی اور انقلابی رویہ جو بغاوت کی حدوں کو چھو رہا تھا اس پورے سیاسی و سماجی نظم و ضبط سے تھا جو مفلوج ہونے کے ساتھ ساتھ عام انسانی زندگی کی ترقی میں مانع بھی تھا۔

تعلیم کے فقدان نے چوں کہ عوامی فکری قوتوں کو سلب کر کے ان میں شکست خوردگی کا ایسا احساس بھر دیا تھا کہ ان میں جدوجہد کا حوصلہ تقریباً مفقود ہو چکا تھا لہٰذا وہ ہر حال میں جی لینے کو اپنا مقدر سمجھ بیٹھے تھے اور ہونے والی تمام زیادتیوں اور ناانصافیوں اور گزرنے والے تمام حادثات اور واقعات کو دیکھتے تو تھے لیکن احتجاجی صلاحیتیں کھو بیٹھنے کے سبب عام طور سے خاموش ہی رہتے تھے چنانچہ ساحر نے اپنی نظموں کے ذریعہ اسی جذبے کو ابھارنے اور ان کے اندر پوشیدہ احتجاجی حوصلہ اور اجتہادی قوت کو تلاش کرنے کا احساس دلانے کا کام کیا۔

اس دور کی بیشتر نظمیں اپنے مزاج اور لہجے کے اعتبار سے احتجاجی اور باغیانہ بھی ہیں اور ساحر کے جذبات و خیالات کی ترجمان بھی۔ جیسا کہ کرشن ادیب کے بیان سے بھی مترشح ہے، اور درحقیقت انہی خیالات کی توسیع و ترسیل کے لیے انھوں نے اخبارات و رسائل کا سہارا بھی لیا۔ اس لحاظ سے کچھ باتیں، شعاعِ فردا، اشعار، کسی کو اداس دیکھ کر، صبحِ نوروز، آوازِ آدم، بہ شرطِ استواری اور وہ نظمیں بھی جو رسائل کے صفحات پر تو محفوظ ہیں لیکن کسی مجموعہ میں شامل نہیں، انفرادی مزاج رکھتی ہیں۔

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا ؎

کسی کو اداس دیکھ کر

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی
نالاں ہوں میں بیداریِ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی ؎

اشعار

دیس کی ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں
اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر
تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے

اس جہنم زار کی باتیں کریں
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں ؎

کچھ باتیں

ساحر کی شاعری اسی تذلیل انسانی کے خلاف ایک احتجاج اور بغاوت کی حیثیت رکھتی ہے وہ جہاں کہیں بھی، جس وقت بھی، اور جس انداز میں بھی انسانیت کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو چیخ اٹھتے تھے۔ ۲۵

ساحر نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام اپنے والد کی حویلی اور بعد ازاں اپنی نانی کے دو منزلہ مکان میں گزارے اور دیال سنگھ کالج لاہور پہنچنے تک عوامی زندگی کی عسرت زدگی کا مشاہدہ کرتے رہے، ان کے دیرینہ رفیق اور ہم مکتب حافظ لدھیانوی اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ساحر کی رہائش بالاخانے پر تھی ..... مکان کے سامنے چھوٹے چھوٹے کمروں میں کوئلہ چننے والیاں اور مزدوری کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ کوئلہ چننے والیاں سارا دن ریلوے لائن پر بکھرے ہوئے کوئلے اکٹھا کرتیں اور ..... دکانداروں کے ہاتھوں بیچتیں۔ ان کا پھٹا لباس تھا۔ ان کے جسموں پر جابہ جا کوئلے کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سب غربت کے نشانات، افلاس کی تصویریں، مظلومیت کے پیکر شب و روز ساحر کے سامنے رہتے۔ ۲۶

یہی ہماری تہذیبی میراث ہے اور یہی ہماری صدیوں پرانی سماجی اقدار، جس کی بقا کی خاطر ہم تصوراتی دنیا میں ڈوب تو سکتے ہیں لیکن

۲۵ حرف حرف چہرے: رفیعہ شبنم عابدی ص ۸۷

۲۶ رومان اور انقلاب کا شاعر مشمولہ فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۳۲

زندگی کے ان تلخ حقائق کا سامنا کر کے انسانیت کو قعرِ مذلت سے ابھار نہیں سکتے ، افسوس ناک امر یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے فرسودہ تہذیبی اور سماجی آداب کو بچانے کی خاطر نہ صرف انسانی حقوق سے چشم پوشی کی ہے بلکہ انسانی قدروں کو پامال اور انسانیت کو بے حال کیا ہے اور درحقیقت یہ تاریخی سچائی بھی ہے اور انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بھی۔ اسی طرح ساحر کی شاعری میں عورتوں کے تقدس کی پامالی کا جو اس قدر شدید احساس ملتا ہے وہ اسی سماجی و تاریخی ، استحصالی رویے سے عبارت ہے۔ چکلے ، صبح نوروز ، سرزمینِ یاس کے علاوہ ایسی کتنی نظمیں ہیں جن میں عورتوں کی نسائیت و حرمت ، جھوٹے سماجی وقار اور تمدنی فریب کی نذر ہوئی ہے :

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں — چکلے

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقاں کی بیٹی افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے — صبحِ نوروز

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر — نورجہاں کے مزار پر

گورنمنٹ کالج لدھیانہ کا یہ پانچ سالہ زمانہ ساحر کی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اسی زمانے میں ان کی شعری و فکری بصیرت نے تلخیاں کے تانے بانے بھی بنے اور اسی زمانے میں ان کی انسانیت ساز بصارت نے مظلوم و مجبور انسانوں کے حقوق کی خاطر استحصال پسند قوتوں سے آنکھیں چار کرنا بھی سیکھا۔ یہی زمانہ آزادیِ وطن کی خاطر ملکی سیاست میں عملی طور پر شریک ہونے اور عوام الناس کو انگریزی سامراج کے خلاف منظم ہونے کی دعوت دینے کا زمانہ تھا، نیز یہی زمانہ دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکیوں کا زمانہ بھی تھا جس میں ہٹلر کے جرمن توسیعی نظریے کے خلاف روس، برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ افواج، اٹلی، جرمنی اور جاپان کی فاشسٹ اور فوجی طاقتوں سے نبرد آزما ہوئیں۔ اس جنگ نے ایک طرف تو ساری دنیا میں معاشی بدحالی پیدا کی اور دوسری طرف ہندستان جو پہلے سے ہی سیاسی غلامی کے سبب معاشی بدحالی کے ستم جھیل رہا تھا، سخت ترین اقتصادی بحران کا شکار ہوا۔ تاہم یہ جنگ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ نہ صرف مغربی اجارہ داروں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی بلکہ اس جنگ کی بدولت ہی جرمن فاشسزم کو، جو سامراجی نظام کی انتہائی شکل تھی، زبردست شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ ہندستان میں برطانوی سامراج کا جبر و تشدد بھی جرمن فاشسزم سے کچھ کم نہ تھا۔ جنگِ عظیم نے ہندستانی عوام کو ایک نئی تبدیلی سے دوچار کیا اور آزادیِ ملک کے تئیں ایک نئے خیال نے جنم لیا جس کے زیرِ اثر انگریزی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش اور ہندستان کی معاشی و معاشرتی زندگی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کو[۲۷] اور تقویت ملی اور درحقیقت

۲۷۔ جدید ادب منظر اور پس منظر: احتشام حسین ص ۱۸

غلامی سے نجات پالینے کا یہ ایک سنہری موقع بھی تھا کیوں کہ انگریزی حکومت پوری طرح جنگ میں الجھی ہوئی تھی۔ ساحر کی نظم ملحۂ غنیمت اسی احساس کی کڑی ہے جس میں آزادی حاصل کر لینے کی تڑپ بھی ہے اور مایوسی کی جھنجلاہٹ بھی اور مجبور و بے بس عوام کے لیے حوصلہ افزا پیغام بھی:

کوئی تیری طرف نہیں نگراں!
یہ گراں بار سرد زنجیریں!
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی
آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا! اے دبی ہوئی مخلوق!

نظم شہزادے کا مزاج اور موضوع بھی ہم وطنوں کی بے حسی پر جھلاہٹ اور طنز کا تاثر پیش کرتا ہے:

ذہن میں اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
یہی اجداد سے ورثے میں ملا ہے تم کو

کاراست طنزیہ وار روایتی نظامِ معاشرت سے ہوتا ہوا ان بے حس لوگوں تک پہنچتا ہے، جن کے نزدیک عالم انسانیت اور اجتماعی زندگی کی خوش حالی سے زیادہ انفرادی زندگی کے عیش و آرام زیادہ اہم رہے ہیں اور اپنے انہی ذاتی مفاد و مقاصد کی خاطر یہ طبقہ ہر دور میں ہر سرِ اقتدار جماعت کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہا ہے۔

جیسا کہ سابقہ اقتباس میں عرض کیا گیا کہ کالج کا زمانہ ساحر کی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی کا زمانہ بن کر آیا اور تلخیاں سا

مجموعۂ کلام دے گیا جس میں ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کی خواہش بھی ہے اور جمہوری اور اشتراکی نظام کے قیام کا ارمان بھی۔ معاشقوں کی ناکامی کا احساس بھی ہے اور سماجی استحصال کے خلاف جنگ کا اعلان بھی۔ اس لحاظ سے ساحر کی شاعری کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصہ رومانیت کی رنگینیوں سے ہم آہنگ ہے اور دوسرا حقیقت کی سنگینیوں سے ہم آغوش۔ گو ساحر کی رومانیت، زندگی و زمانے کی حقیقتوں سے کبھی جدا نہیں رہی بلکہ اس کے متوازی اور اس سے متصل چلتی رہی۔ ردِ عمل، یکسوئی، شہکار، معذوری، شکست، کسی کو اداس دیکھ کر کی رومانیت محض عشق و محبت کے حسین خواب و خیال کی غماز نہیں ہے بلکہ حیات اور حالات کے تلخ حقائق اور آلام و مصائب کے شدید احساس سے دوچار بھی ہے تاہم ساحر کی شعری زندگی کے ابتدائی دور کا وہ سرمایہ جو کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ہے یقیناً خالص عشقیہ اور انقلابی شاعری کا ہے جو جذباتیت سے پُر ہونے کا احساس دلاتا ہے اس لیے یہ کہنا کہ ساحر کی شاعری ابتدا ہی سے فکر و آگہی کی بلندیوں کو چھو رہی ہے، غیر مناسب بھی ہے اور لایعنی بھی۔ اس کے برخلاف عنفوانِ شباب سے گزرتے ہوئے ایک طالبِ علم کے جذبات، عشقیہ خیالات کے سلسلے میں جس رنگینی کے طالب ہوتے ہیں وہ رنگینی ساحر کے ان اشعار سے نمایاں ہوتی ہے جس کے بارے میں خود ساحر نے بھی کہا تھا کہ یاد رکھنے کے قابل نہیں ہیں ۲۸ تاہم ان کے ہم جماعت اور ہم مکتب اور ان سے قربت رکھنے والے ان دوستوں کی

۲۸ تفصیلات کے لیے نریش کمار شاد کو دیے گیے ساحر کے انٹرویو سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

یادداشت سے ان پر کافی روشنی پڑتی ہے[۲۹] البتہ ان یادداشتوں والے ساحر کے اشعار کو سطحی جذباتیت قرار دیں تو غلط نہ ہوگا، اب یہ اور بات ہے کہ اس سطحی جذباتیت میں بھی جذبۂ صادق کارفرما رہا ہے۔

کالج کے زمانے میں ساحر کے معاشقوں کا جو ذکر ملتا ہے اس میں ساحر کے انقلابی رویوں اور شعری صداقتوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ آزادانہ میل جول مہذب معاشرے میں نامہذب فعل تصور کیا جاتا تھا۔ حالانکہ مخلوط تعلیم ہونے کے باوجود یہ احساس طلبہ و طالبات کے ذہن و دل پر طاری تھا۔ اسی کالج کی ایک طالبہ مہندر چودھری، جس کے والد نہ صرف شہر کے سربرآوردہ لوگوں میں تھے بلکہ کانگریس کے معزز لیڈر سمجھے جاتے تھے اور برٹش امپیریلزم کے خلاف مجتہد بھی تھے۔ چنانچہ وہ خود بھی فطری طور پر ہندستان کے حال اور انگریزوں کی چال سے آگاہ تھی لیکن لڑکی ہونے کے سبب سامراجیت کے خلاف نفرت و بغاوت کا جذبہ ہونے کے باوجود اس کے برملا اظہار سے قاصر تھی۔ ساحر جو اس وقت تک یونین کے اجلاس اور مشاعروں میں انگیز مخالف تقریروں اور سیاسی اور انقلابی نظموں کی بدولت بہت مقبول ہو چکے تھے، مہندر چودھری کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ ساحر کی شاعری، ان کے خیالات و نظریات اور انگریزی سامراج سے متعلق ان کی سوچ سے نہ صرف متاثر تھی بلکہ "اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ

[۲۹] یہ ساحر کے وہ دوست ہیں جو گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں بھی ان سے قریب رہے ہیں اور کالج کے باہر بھی ان سے متعلق رہے ہیں۔ مثلاً قمر اجنالوی اور حافظ لدھیانوی وغیرہ، جن کے مضامین فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر میں موجود ہیں۔

اس کے جذبات، اس کے احساسات کو ساحر نے زبان دے دی ہے
اس کے خیالات و افکار کی ترجمانی کی ہے[۳۰] اس طرح فکر و نظر کی یکسانیت اور خیال و جذبے کی مطابقت نے اسے ساحر سے قریب تر کر دیا۔ مہندر چودھری کے دل میں ساحر کے لیے جتنا احترام اور مقام تھا، ساحر کے دل میں بھی محبت کی اتنی ہی شدت اور چاہت کی اتنی ہی صداقت موجزن تھی اور اگرچہ اس رفاقت کی بدولت ساحر نے کئی انقلابی اور رومانی نظمیں تخلیق کیں لیکن رفاقت کی یہ مسرت تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ مہندر چودھری تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہوئی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس حادثہ کا ساحر پر شدید اثر ہوا۔ ان کی نظم مرگھٹ کی سرزمین انہی شدید ترین اثرات کی عکاس ہے۔[۳۱]

کوثر میں وہ دھلی ہوئی باہیں بھی جل گئیں
جو دیکھتیں مجھے، وہ نگاہیں بھی جل گئیں
معصوم قہقہوں کا ترنم بھی مٹ گیا
جھینپی ہوئی نظر کا تبسم بھی مٹ گیا[۳۲]

ان مصرعوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ ایک حسن پرست اور جذباتی نوجوان کے دل کا غبار ہے جس میں فکر کی گہرائی کم اور احساس و جذبے کی فراوانی زیادہ ہے۔ ابتدائی دور کی اس رومانی شاعری کے علاوہ سیاسی و انقلابی شاعری میں بھی جذباتیت کا

۳۰۔ رومان اور انقلاب کا شاعر: حافظ لدھیانوی ص ۱۲۹
۳۱۔ یہ نظم بھی کسی مجموعۂ کلام میں شائع و شامل نہیں ہے۔
۳۲۔ مصرعوں کی یہ غیر مطبوعہ نظم پہلی بار فن اور شخصیت، ممبئی کے ساحر نمبر میں شائع ہوئی ہے۔

کا رنگ زیادہ گہرا ہے بہ الفاظ دیگر شاعری کم اور نعرہ بازی زیادہ ہے۔ حافظ لدھیانوی نے ابتدائی دور کی شاعری پر اپنے مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اپنی تنقیدی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس کی شاعری کا آغاز انقلاب کے نعرہ سے ہوا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں، شاعری کم تھی اور نعرہ زیادہ۔ شعر میں وہ پختگی، بات کرنے کا ڈھنگ، زبان و بیان کا آہنگ نامانوس تھا۔ آج بھی مجھے اس دور کے چند اشعار یاد ہیں۔ جن سے اس کی شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے :

مرا کیا ہے مجھے تو کھانسنے میں خون آتا ہے
چراغِ زندگی بجھنے کو ہے اب ٹمٹماتا ہے ؎

مجھ کو جانے دو (کہ) میرا منتظر ہے انقلاب
دیکھ ابھرا چاہتا ہے عصرِ نو کا آفتاب ؎ ۳۲

اس منزل میں جب کہ غیر ملکی تسلط کے خلاف بغاوت کر جانے اور کہنہ نظامِ معاشرت کے خلاف زبردست احتجاجی رویہ اختیار کرنے کے باوجود ناکامی و نامرادی کا احساس ابھرنے لگتا ہے تو پورے نظام کے خلاف جھلاہٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور مایوسی اور ناامیدی دامن گیر ہو جاتی ہے۔ مجاز کے یہاں شاعر آتشِ نفس کا خون کھولنے اور مردہ چاند تارے نوچنے اور اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونکنے، مجروح کے یہاں ستونِ دار پر چراغِ سر رکھنے اور پاؤں میں زنجیروں کے باوجود رقص کرنے، فیض کے یہاں آگ میں پھول کھلانے کا تصور بھی اپنی اسی بے بسی، فرسودہ دستور اور کہنہ آئین و قوانینِ معاشرت اور اس کے مظالم سے شدید ترین نفرت و بغاوت کا ہی عکاس ہے گو ان شعراء کی یہ تخلیقات فکری بصیرت سے مملو ہیں۔

۳۳ رومان اور انقلاب کا شاعر : حافظ لدھیانوی ص ۱۲۹

لیکن ساحر کی ابتدائی شاعری میں نمایاں سطحی جذباتیت اور نعرہ بازی کے باوجود ساحر کا وہ پیغام بھی اپنی جگہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے جس میں وہ عصرِ نو کے آفتاب ابھرنے کا احساس دلاتے ہیں۔

ملکی سیاست میں غیر معمولی دلچسپی اور ہندستان اور انسان کو آزاد اور خوش حال دیکھنے کی تمنا نے ان کو طلبہ کے درمیان مقبول بنایا اور وہ اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری منتخب کر لیے گئے، ویسے بھی کسی کالج یونین کا سکریٹری ہونا بجائے خود عزت و شہرت کا باعث ہوتا ہے چنانچہ نہ صرف ساحر کی مقبولیت میں ہی اضافہ ہوا بلکہ ہر محفل میں ان کی پذیرائی بھی ہونے لگی۔ اور بی اے کے آخری سال میں پہنچتے پہنچتے وہ اسٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی چن لیے گئے، خود انہی کے الفاظ میں:

> میں ایک سال تک طالب علم فیڈریشن کا
> سکریٹری رہا اور ایک سال پریسیڈنٹ بھی سیاست
> سے مجھے لگاؤ تھا اس وجہ سے ایک بار پٹا بھی۔۔۔۔
> میرے دل میں اسی وقت سے یہ بات نقش ہوگئی کہ
> کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کا برتاؤ بہت برا ہے۔ [۳۴]

سیاست سے لگاؤ اور کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کا برا برتاؤ، اسی احساس نے ساحر کو مجبور و بے بس عوام اور بے سہارا لوگوں کا ہم درد بنایا اور درحقیقت حالات و ماحول کے جبر سے پیدا شدہ آلام و مصائب اور غربت و افلاس کے شکار اسی طبقہ کی نمائندگی ساحر نے اپنی شاعری میں کی ہے اور آغاز تا انجام ساحر کی شاعری کے مرکز یہی عوام رہے ہیں۔ ان کی نظم جاگیر اسی تاثر کی گواہی دیتی ہے۔

اس زمانے میں ساحر کی شاعری میں نسبتاً زیادہ نکھار پیدا ہوا اور

---

[۳۴] ہم کہ ٹھہرے اجنبی: بلونت سنگھ انٹرویو مشمولہ فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۴۷

اگرچہ ان کی شعری شخصیت کی تشکیل میں جوشؔ اور فیضؔ کا نمایاں حصہ رہا ہے لیکن اس منزل میں جوشؔ کے انقلابی آہنگ پر فیضؔ کا رومانی لب و لہجہ غالب آگیا۔ شعاعِ فردا اور میرے گیت کا اسلوب اسی تبدیلی کا احساس دلاتا ہے۔

اسی اثنا میں ساحرؔ کی کوششوں سے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی ابتدا ساحرؔ نے اپنی تازہ ترین نظم گریز سے کی۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا اس کامیابی نے ساحرؔ کی شہرت میں اور اضافہ کیا اور اپنی شعری تخلیقات، اپنے افکار و خیالات اور اپنے سیاسی نظریات کی بدولت وہ نہ صرف ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے بلکہ نوجوان دلوں کی دھڑکن بھی بن گئے اور یہ دھڑکن کسی کو اداس دیکھ کر میں بہت صاف سنائی دیتی ہے۔ اس نظم کا محرک اگرچہ ساحرؔ کا ناکام معاشقہ ہے لیکن اس کے در پردہ زمانے کی نیرنگیوں اور حالات و ماحول کی سنگینیوں کی واضح جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

ہرمیندر کور جو اسی کالج کی طالبہ تھی ساحرؔ کے لیے جاذبِ توجہ بنی تو محبت کا اٹوٹ رشتہ بھی قائم ہوگیا لیکن عشق تھا چھپ نہ سکا چنانچہ نہ صرف کالج میں ہی اس کی بازگشت سنائی دی بلکہ اس کے احاطے سے باہر بھی نکل گئی۔ اس زمانے کی اور جاگیردار گھرانے کی لڑکی اور عشق سا نامہذب فعل۔ ہرمیندر کور کو بدنامی کا خوف ستانے لگا اور وہ رسوائی کی دہشت سے پریشان ہو اٹھی اور اداس اور مضمحل رہنے لگی اور اسی عالمِ اضمحلال میں ایک دن ساحرؔ سے قطعِ تعلق کا اظہار کر بیٹھی۔ ساحرؔ پر اس واقعہ کا شدید اثر ہوا اور اس سلسلۂ انقطاع نے ان کو جھنجوڑ ڈالا۔ مذکورہ نظم اسی زخم خوردگی اور حالات کی ستم ظریفی کی مظہر ہے۔ عہدِ طفولیت سے لے کر دورِ شباب تک ساحرؔ مستقل ناکامی کا شکار ہوتے رہے۔ حکمرانوں اور جاگیرداروں

سے نفرت ملی، اور الفت میں ناکامی اور ساحر کے بکھرنے ٹوٹنے کا عمل جاری رہا۔ اور وہ کہہ اٹھے:

میں جانتا ہوں زمانے کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمھیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اداس ہو تم

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

اور یہ بات وضاحت طلب نہیں ہے کہ برہیندر کور ہی ساحر کی نظم یکسوئی کی وہ لڑکی ہے جسے ایسے بے رحم سماج کے بندھے ٹکے اصولوں اور از کار رفتہ ضابطوں سے، جس نے انسانی زندگی کی ترقی کو التوا میں ڈال دیا ہے اور خود اپنے ہی بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار چھین لیا ہے

ساحر ایسے بے رحم سماج اور اس کے بنائے ہوئے غیر انسانی اصولوں اور ضابطوں سے بغاوت کر جانے کا پُر عزم پیغام دیتے ہیں:

جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

ساحر کا یہ معاشقہ نہ صرف ناکامی پر منتج ہوا بلکہ برہیندر کور

کو کالج سے نکال بھی دیا گیا۔[۳۵]

ساحرؔ کو عورتوں کی بے بسی اور محرومی اور سماجی بندشوں کے سبب ان کی ذہنی الجھنوں اور حق تلفیوں کا ابتدا سے ہی شدید احساس تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں وضاحت کے ساتھ موجودہ سماج کی چیرہ دستیوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا:

> ہمارا سماج ایک جنسی سماج ہے یہاں مرد کا بول بالا ہے اس لیے ہمارے یہاں کی عورتیں، مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول نہ رکھ سکنے کی وجہ سے محبت کے گورکھ دھندے سے دور ہی رہتی ہیں اور اگر کوئی عورت بھولے بھٹکے محبت کر بھی لے تو سماج کی بندشیں اتنی مشکلات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ اکثر بے وفائی کر کے اپنی جان چھڑاتی ہے[۳۶]

اور جوں جوں غیر ملکی حکمرانوں کا استبداد، زوال آمادہ جاگیردارانہ سماج کا استحصالی رویہ، آئینی ضابطوں کا جبر اور انسانی عدم مساوات کا زور بڑھتا گیا، آزادی اور انصاف کی خاطر ساحرؔ کی سرگرمیاں

---

[۳۵] حمید اختر کے بیان کے مطابق لڑکی کا نام ہریندر کور نہیں ایشر کور تھا، دوسرے یہ کہ کالج کے حکام نے اس جرم کی پاداش میں دونوں کو کالج سے نکالا تھا۔ اس کے برخلاف حافظ لدھیانوی کی تحریر سے اس کا نام ہریندر کور ثابت ہوتا ہے یہ زیادہ معتبر اس لیے بھی لگتا ہے کہ موصوف ساحرؔ کے اس معاشقہ میں خود مددگار رہے تھے جب کہ حمید اختر اس معاملے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ کالج سے نکالے جانے کے سلسلے میں مختلف آرا ہیں جس پر آگے کے صفحات میں حوالوں کے ساتھ بحث کی جائے گی۔

[۳۶] ہم کہ ٹھہرے اجنبی: بلونت سنگھ ص ۴۹

اسی رفتار سے تیز ہوتی گئیں۔ چنانچہ ان پر کئی بار حکومت کا عتاب بھی نازل ہوا۔ نظموں کے ضبط ہونے کا سلسلہ بھی اسی عتاب کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ساحر حکومت اور کالج کے اربابِ اقتدار کی سازشوں کا شکار ہوئے اور کالج سے برخاست کر دیے گئے۔ برخاستگی کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے سی ایل کاوش رقم طراز ہیں:

> کرتار سنگھ سرابہ ایک انقلابی شہید تھا۔
> نوجوانوں نے اس کا شہیدی دن منایا ..... ساحر بھی گئے۔
> انھوں نے نظم پڑھی۔ کالج والوں نے ساحر کو کالج سے نکال
> باہر کیا۔ [۳۷]

اس کے برخلاف گوپال متل نے اپنی کتاب لاہور کا جو ذکر کیا میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے ساحر کے اخراج کا سبب یہ بتایا ہے کہ:

> کالج کے حکام حقیقی مخلوط تعلیم کے تجربے میں
> ناکام ہوئے تو ان تمام طلبہ کو کالج چھوڑ دینے کا مشورہ دیا
> جو مخلوط تعلیم کے حق میں تھے۔ ساحر بھی ان میں سے ایک
> تھے چنانچہ کالج چھوڑ لاہور چلے گئے [۳۸]

اور حمید اختر کے بیان کے مطابق برخاستگی کا سبب معاشقہ ہی تھا، لکھتے ہیں:

> اس کی (ساحر کی) پُرامن زندگی میں طوفان
> اس وقت آیا جب اسے لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے

---

۳۷ مضمون انارکلی سے پرچھائیاں تک، مشمولہ فن اور شخصیت ساحر نمبر ص ۱۱۰

۳۸ لاہور کا جو ذکر کیا: گوپال متل ص

نکال دیا گیا .... اس کا معاشقہ بڑے زوروں
سے اپنی ایک کلاس فیلو سے چل رہا تھا۔ چند دوستوں نے
.... اس کی شکایت پرنسپل سے کر دی چنانچہ کالج کے
حکام نے اسے اور اس کی معشوقہ ایشر کور کو کالج سے نکال دیا ۳۹؎

مذکورہ اقوال میں سی ایل کاوش اور حمید اختر کے بیانات سے اتفاق کی گنجائش نکلتی ہے کیوں کہ ساحر انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور نظمیں بھی پڑھتے تھے چنانچہ اس صورت میں حکام پہلے سے ہی ناراض تھے بعد ازاں شہیدی دن میں ساحر کی شرکت نے اس جذبے کو اور مستحکم کر دیا لیکن کالج سے نکالنے کے لیے جس ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی وہ معاشقہ نے فراہم کر دیا، جب کہ گوپال متل کے مطابق ساحر نے از خود کالج چھوڑا، بعید از قیاس اس لیے بھی ہے کہ ساحر نے کالج سے نکالے جانے کا خود ذکر کیا ہے نیز کالج سے نکالے جانے والی روایت پر اکثر مضمون نگار متفق ہیں ۴۰؎ چوں کہ گوپال متل نے یہ کتاب محض یاد داشت کے سہارے لکھی ہے اس لیے جو مناسب معلوم ہوا وہ لکھ دیا۔ حالانکہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ گوپال متل نے دانستہ حکومت کے فرماں بردار کالج کے ارباب اقتدار کی حقیقت بیان کرنے سے گریز کیا ہے لیکن ان سے حقائق کے بیان میں سہو ضرور ہوا ہے۔ بہر حال آمدم بر سر مطلب نظم نذر کالج نہ صرف انہی شدید ترین احساسات و کیفیات کا نتیجہ اور دلی رنج و غم کا اظہار ہے بلکہ اس میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں گزارے ہوئے ماہ و سال کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے اور ارباب اقتدار کی کیا دلوں پر گہرے طنز کی کاٹ بھی نمایاں ہے:

۳۹؎ ساحر میرا بچپن کا دوست، مضمون مشمولہ فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۴۴
۴۰؎ یہ مضمون نگار ہیں حافظ لدھیانوی، حمید اختر، بلونت سنگھ اور نرلش کمار شاد وغیرہ
پھر اس نظم کا آخری مصرعہ بھی ثبوت فراہم کرتا ہے: "گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں ہم"

کھلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول
ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِ وطن سے نکل گئے
معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے ؎

یہ نظم اس زمانے کی ہے جب کہ ساحر بی اے کے آخری سال میں تھے لیکن معتوب ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد ساحر نے لدھیانہ کو خیرباد کہا اور لاہور کا رخ کیا۔ لاہور میں انھوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے کا لاہور اگرچہ کوئی بڑا صنعتی شہر نہیں تھا لیکن علمی و ادبی اور سیاسی و تہذیبی سرگرمیوں کے لحاظ سے ملک کا اہم ترین مرکز ضرور تھا۔ لدھیانہ میں ساحر کو کامریڈ مدن لال دویدی، حافظ لدھیانوی، ہرکشن لال آرٹسٹ، عجائب چترکار، حمید اختر اور احمد ریاض ایسے مخلص دوستوں کی رفاقت حاصل تھی اور لاہور میں شورش کاشمیری، دیوبندر ستیارتھی، رام پرکاش اشک، گوپال متل، کرشن چندر، حفیظ ہوشیارپوری، پنڈت ہری چند اختر جیسے مشاہیر اور نوجوان ادباء و شعراء کی معیت نصیب ہوئی۔ اس زمانے میں حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش، محمد دین تاثیر اور صوفی تبسم اگرچہ بزرگواروں میں سے تھے تاہم ساحر کا تعلق ان حضرات سے بھی قائم رہا۔ ان دنوں جیسا کہ عرض کیا گیا، لاہور علمی و ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ علم و ادب کے مختلف حلقے بھی تھے اور مختلف سبھائیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں حلقۂ اربابِ ذوق، حلقۂ اربابِ علم اور اردو سبھا بالخصوص لائقِ توجہ تھیں اور ان

سب میں نمایاں انجمن ترقی پسند مصنفین تھی۔ شورش کاشمیری ان دنوں شاہکار کے مدیر تھے جو قومی نظریات کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی سامراج کے خلاف انقلاب و بغاوت کا نقیب بھی تھا، شورش کاشمیری، جیسا کہ مدیر بیسویں صدی رحمٰن نیر نے لکھا ہے[۵۴۱] احرار تحریک سے وابستہ تھے لیکن ان کا تعلق ان تمام تحریکوں اور جماعتوں سے تھا جو انگریز مخالف تھیں۔ ساحر نے ان تمام انقلابیوں کے ساتھ انگریز حکمرانوں کے خلاف جلسوں، مشاعروں اور تحریروں کے ذریعہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور اگرچہ وہ "ابتدا میں احراری تحریک سے متاثر تھے (لیکن) بعد میں مارکسزم کے قریب آئے اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔"[۵۴۲] اس زمانے میں دوسرے انقلابیوں کی طرح ساحر کو بھی بس ایک ہی دھن تھی اور وہ تھی ملک کو آزاد کرانے کی دھن۔ انجام کار دوسرے انقلابیوں کی طرح انھیں جیل تو نہیں بھیجا گیا لیکن کالج سے نکال دیا گیا۔ دیال سنگھ کالج لاہور کے قیام کی مدت اگرچہ بہت کم تھی لیکن اس قلیل مدت کے باوجود ساحر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔ گوپال متل اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:

> لدھیانے کے کمیونسٹوں کو، جن کے لیے ساحر کافی مفید تھے یہ تشویش ہوئی کہ گوپال متل کی صحبت میں پڑ کر ساحر کا ترقی پسندی پر سے ایمان اٹھ جائے گا

۵۴۱ ماہنامہ بیسویں صدی: رحمٰن نیر ص ۱۹

۵۴۲ ایضاً ایضاً ایضاً (رحمٰن نیر کا یہ خیال محض قیاس پر مبنی ہے کیوں کہ ساحر ابتدا ہی سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن آف انڈیا سے وابستہ رہے ہیں جو مارکسی نظریے سے متصف طلبہ کی تنظیم ہے۔ نیر صاحب اگر حوالے کے ساتھ تحریر کرتے تو یقیناً میری رہنمائی ہوتی)

انھوں نے لاہوری کمیونسٹوں سے استمداد کی جنھوں
نے ساحر کے ایمان کو راسخ بنانے کے لیے انھیں لاہور
اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بنا دیا۔ لیکن ساحر کی
دلچسپیاں تعلیم اور سیاست دونوں سے بس واجبی
ہی تھیں۔ نہ ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن چلا نہ
لیڈری کا۔ [۴۳]

حالانکہ بلونت سنگھ کو دیے گیے اپنے انٹرویو میں ساحر نے واضح لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ سیاست سے مجھے لگاؤ تھا اس لیے ایک بار پڑا بھی، بار بار حکومت کا عتاب نازل ہونا ناز صدیقی سے بھی ثابت ہے۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کی وجوہات پر پچھلے صفحات میں غور کیا جا چکا ہے۔ اب رہا معاملہ سیاست کا تو اس ضمن میں اتنا ہی عرض کرنا کافی ہوگا کہ متل صاحب کے نزدیک لیڈری چلنے کا مقصد شاید منصب ہو اور سیاست سے دلچسپی کا مطلب حکومت کے خلاف نعرے لگانا اور ارباب اقتدار کے خلاف اپنے باغیانہ فعل کا مظاہرہ کرنا ہے جو ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کا نظریہ تھا، حالانکہ لاہور کا جو ذکر کیا میں، ساحر سے متعلق بیشتر باتیں عمداً یا سہواً غلط بیان کی گئی ہیں اور حقیقت پیش کرنے کی جگہ صرف خیال سے کام چلا لیا گیا ہے، اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ ساحر کا سیاست سے لگاؤ، انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پالیسی اور استحصال پسند رویوں کے خلاف لوگوں میں حوصلہ اور جرأت پیدا کرنا تھا جو انھوں نے عملی سطح پر اسٹوڈنٹس یونین کے نمائندہ کی شکل میں بھی کیا اور شاعری کے ذریعہ بھی۔ ساحر کے ایمان کو راسخ بنانے اور کمیونسٹ نظریات کی پابندی کرنے

۴۳ لاہور کا جو ذکر کیا: گوپال متل ص

کا سوال، ایک الزام ہے کیوں کہ ساحر نے سوشلزم میں اپنے یقین کو
بار بار دہرایا ہے اور نریش کمار شاد والے انٹرویو میں اس کی توضیح
بھی کی ہے ٭٭٭ مثل صاحب چوں کہ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی سے وابستہ
تھے جو ایک انتہا پسند جماعت تھی اس لیے نظریاتی اختلاف بھی ان کی
تحریروں میں در آیا ہے۔ گو یہ بات درست ہے کہ ترقی پسند تحریک
کے نظریات، کمیونسٹ نظریات سے مملو تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ
اخذ نہیں کیا جانا چاہیے کہ جو ترقی پسند ہے وہ کمیونسٹ بھی ہے۔ ساحر
نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود ہر اس نظریے اور خیال
کی مذمت کی ہے، جس میں ادب کو سیاسی آلۂ کار کے طور پر استعمال
کرنے پر زور دیا گیا ہے کیوں کہ وہ ادب کو ادب بنانے کے حق میں
تھے سیاسی پروپیگنڈہ نہیں۔

دیال سنگھ کالج لاہور سے اخراج کے سبب ان کا ایک سال اور
ضائع ہو گیا تاہم اگلے تعلیمی سال میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا
لیکن مسلسل دو برسوں کی بربادی نے انھیں کالج کی زندگی سے بے نیاز
کر دیا چنانچہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے کالج چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں دوسری
نظموں کے علاوہ ساحر کی پہلی آزاد نظم اجنبی محافظ منظرِ عام پر آئی
جس میں انھوں نے ہندوستانی قوم کی بے حسی کو للکارا ہے۔ دہقانوں کی
مفلوک الحالی اور افلاس زدہ مجبور لڑکیوں کے داغ دار تقدس کی عکاسی
کی ہے:

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
- - - - - - - - - - - - - - - - -
منہ میں سگریٹ لیے ہاتھوں میں برانڈی کا گلاس

٭٭٭ مزید تفصیلات کے لیے نریش کمار شاد کے انٹرویو سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

جیب میں لقمۂ سکوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدس یعنی
کسی دوشیزۂ مجبور کی عصمت کا غرور
کاش یہ بے حس و بے وقعت و بے دل انسان
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ان کے دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود
اور پورب سے امڈتے ہوئے خطرے کے لیے
یہ کرائے کے محافظ نہ منگانے پڑتے

یہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا، پورے ملک میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً لاکھوں لوگ اس قحط و بربادی کا شکار ہو کر بھوکے مر گئے۔ ذخیرہ اندوزوں کی حریصانہ ذہنیت نے مہنگائی کو جنم دیا جو بڑھتے بڑھتے کال سے جنجال بن گئی۔ یہ قیامت خیزیاں دوسری جنگ عظیم کی پیدا کردہ تھیں جن کی تصویریں صرف تاریخ کے صفحات پر ہی منعکس نہیں ہوئیں بلکہ اس کے نقوش اردو ادب میں بھی نمایاں ہوئے اور پورے پس منظر کے ساتھ ہوئے۔ کرشن چندر کا افسانہ ان داتا اسی تاریخی سچائی کا تاثر دیتا ہے اور جگر مرادآبادی کی نظم ؎

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں

کے علاوہ متعدد شاعروں اور ادیبوں نے اس المناکی کو اپنے جذبہ و احساس کا حصہ بنایا ہے۔ ساحر کی نظم قحط بنگال انہی اثرات کی نشاندہی

کرتی ہے:

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیش کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے

یہ نظم مولانا تاجور کے ادبی جریدہ شاہکار میں شائع ہوئی جس کے مدیر ان دنوں شورش کاشمیری تھے۔ اس نظم سے متعلق سی ایل کاوش کے بیانات خصوصی توجہ کے حامل ہیں، بالخصوص اس شعر:

چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

کے تعلق سے ان کی تحریریں خاصی اہمیت اختیار کر گئی ہیں، لکھتے ہیں:

یہ نظم ساحر نے ہمارے سامنے کہی۔۔۔۔۔۔
آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی، ساحر نظم کہہ رہا تھا، ایک شعر رہ گیا تھا۔ شورش نے ایک شعر کی جگہ دو لکیریں ڈال کر نظم کی کاپی بھی پریس میں بھجوا دی۔ پرچہ چھپ کر آیا تو دھوم مچ گئی ۔۔۔۔۔۔۔ شام کو ہم لوگ احرار کے دفتر میں گئے تو شاہ جی (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) نے کہا سنا بھئی وہ نظم سنا دو جو تم نے تازہ لکھی ہے۔ ساحر نے نظم شروع کی۔۔۔۔ (آگے چل کر) ساحر نے کہا۔ یہاں ایک شعر نہیں ہو سکا۔۔۔۔ لکھو ساحر

شعر ہو گیا۔

چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

شورش اچھل گیا ـــــ ساحر نے اپنی گہری آنکھوں سے شاہ جی کی طرف دیکھا اور اس شعر کو تبرک سمجھ کر اپنے کلام میں شامل کر لیا ـــــ (اور) من وعن اپنے دیوان میں شاہ جی کے حوالے سے شامل (کیا)۔ [۴۵]

اس طویل حوالے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ ساحر کے اولین مجموعۂ کلام تلخیاں میں یہ نظم شامل ہے اور دوسرا اور تیئسواں ایڈیشن میرے پیش نظر ہے پھر بیچ کے دوسرے ایڈیشن بھی میری نگاہ سے گزرے ہیں لیکن زیر مطالعہ کسی بھی ایڈیشن میں شاہ جی کا حوالہ نہیں ہے۔ گمان غالب ہے کہ پہلے ایڈیشن میں شاہ جی کا حوالہ 'واوین' کی شکل میں رہا ہوگا (مگر چوں کہ یہ ایڈیشن دستیاب نہ ہو سکا اس لیے صحیح صورت حال بھی سامنے نہ آسکی) لیکن ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ بعد کی اشاعتوں میں حقیقت حال سے بے خبر ہونے کے سبب کاتب سے سہو ہوا ہو اور اس نے 'واوین' خارج کر دیا ہو لیکن کم از کم ساحر کو اس پر دھیان ضرور دینا چاہیے تھا گو ظ انصاری کے بیان کے مطابق ساحر مجموعۂ کلام کو اول تو دیکھتے نہیں تھے اور دیکھتے بھی تھے تو سرسری گزر جاتے تھے [۴۶] تاہم اگر ایسا ہے تو اسے ادبی بد دیانتی پر محمول ضرور کیا جائے گا۔ کیوں کہ دوسرے کی چیز بہر حال اپنی نہیں ہو سکتی۔

۴۵ انارکلی سے پرچھائیاں تک ص ۱۱۳

۴۶ ساحر کی یاد میں، مضمون مشمولہ فن اور شخصیت، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۵۸

بہر حال اسلامیہ کالج لاہور چھوڑنے کے بعد سے ادب لطیف کی ادارت ملنے تک کا دور ساحر کی صعوبتوں اور مالی پریشانیوں کا دور رہا ہے، اور بیکاری انسانی زندگی کا سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔ والد کے ورثے اور ملکیت سے محروم تھے ہی پھر والدہ کے زیورات تک مقدمات کی نذر ہو گئے تھے، ماموؤں نے کفالت کی مگر ساحر اب باشعور ہو چکے تھے، حساس اور خوددار انسان تھے ان کی غیرت نے محض اپنے خوش آئند مستقبل کی خاطر بوجھ بننا گوارہ نہ کیا چنانچہ "ساحر نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرتب کیا اور اس کو فروخت کرنے نکلے، شاید اس موقع پر ان کے ذہن میں تصنیف و تالیف کے سہارے جی لینے کا منصوبہ ہو۔"[۴۷] لیکن کامیابی ان سے دور دور چلتی رہی۔ برسوں دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے بعد پریت نگر بک شاپ لاہور نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی اور اس طرح ۱۹۴۴ء میں ساحر کا پہلا مجموعۂ کلام تلخیاں کے عنوان سے شائع ہوا، جو چھوٹے سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس مجموعہ پر قومی جنگ (نیا زمانہ بمبئی) میں تبصرہ بھی شائع ہوا لیکن کیفی اعظمی کے مطابق "یہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔"[۴۸] کیفی اعظمی کو مغالطہ ہوا ہے اور انھوں نے صحیح سالِ اشاعت یاد نہ ہونے کی صورت میں یہ بات کہہ دی ہے جب کہ ساحر تلخیاں کے چھٹے ایڈیشن میں وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

> تلخیاں کا زیر نظر ایڈیشن جو نیا ادارہ کے توسط سے آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اس کتاب کا چھٹا ایڈیشن ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن تقسیم ہند سے تین برس قبل پریت نگر بک شاپ لاہور سے چھپا تھا۔[۴۹]

۴۷ ساحر لدھیانوی ۔ کیفی اعظمی، نئے ادب کے معمار، کتاب پبلشرز لمیٹیڈ، بمبئی ۱۹۴۸ء ص ۸
۴۸ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۰
۴۹ ابتدائیہ تلخیاں: ساحر لدھیانوی: نیا ادارہ لاہور چھٹا ایڈیشن ۱۹۷۱ء

انہی دنوں ساحرؔ نے چودھری نذیر احمد کے جریدے ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالی۔ ادبِ لطیف کے اداریے اور تبصرے کی بدولت ساحرؔ نہ صرف نئے لکھنے والے ترقی پسند شعراء و ادباء میں مقبول ہوئے بلکہ تنقیدی رضا مین کی بدولت ناقدینِ ادب میں بھی ہر دل عزیز ہو گئے اور جب شورش کاشمیری نے شاہکار سے علاحدگی اختیار کرلی تو اس کی ادارت بھی ساحرؔ کے ذمے آگئی اس طرح مکمل طور پر صحافت کے میدان میں قدم جما لینے کے بعد ساحرؔ ان جریدوں کے ذریعہ نئے لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور ان سے ترقی پسند خیالات و نظریات کی ترویج و اشاعت کا کام بھی لیا۔

اسی زمانے میں ساحرؔ کی ملاقات پنجابی زبان کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ امرتا پریتم سے ہوئی جو ابھی اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور میں تھیں۔ ساحرؔ امرتا پریتم کی پنجابی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کرتے اس طرح ساحرؔ کا امرتا پریتم سے قربت و رفاقت کا سلسلہ شروع ہوا، جسے امرتا پریتم نے ایک خط میں محفوظ کرلیا ہے اور اپنی رفاقت و محبت کا برملا اظہار اپنی خود نوشت سوانح حیات رسیدی ٹکٹ میں کیا ہے۔ ساحرؔ کی نظم ایک تصویر رنگ اسی قربت کی آئینہ دار ہے۔

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بیتاب نظر آئی تھی

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جب حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا تو بہ طور مقالہ نگار لاہور سے

ساحر کو بھی مدعو کیا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہ پانچویں کل ہند کانفرنس تھی جس کا افتتاح مسز سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ ساحر نے اردو کی جدید انقلابی شاعری[۵۰] کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا جو نہ صرف خاموشی سے سنا گیا بلکہ سراہا بھی گیا۔ اس کانفرنس میں ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے ادباء و شعراء اور ناقدینِ ادب نے شرکت کی تھی جن میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، مجاز، فراق گورکھپوری، سبط حسن، مولانا حسرت موہانی، نیاز حیدر، رفعت سروش، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، پروفیسر احتشام حسین علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ساحر سب سے کم عمر مقالہ نگار تھے۔

اس مقالے کے ذریعہ ساحر پر نہ صرف ترقی کے دروازے ہی کھلے بلکہ مقتدر اور معتبر ترقی پسندوں میں ان کی شخصیت بھی نمایاں ہوئی چنانچہ کانفرنس کے اختتام کے بعد ساحر ان لوگوں کی ایما پر، بجائے لاہور جانے کے قسمت آزمانے بمبئی چلے آئے اور بمبئی جو ان دنوں ترقی پسند ادباء اور شعراء کا مسکن بنا ہوا تھا، ساحر کے لیے ذہنی سکون کا باعث اور نظریاتی فروغ کا ذریعہ بن سکتا تھا دوسرے یہ کہ ذریعۂ معاش تلاش کرنے اور فلموں سے وابستہ ہونے کے مواقع بھی فراہم ہو سکتے تھے اور ان دنوں بہت سے ترقی پسند ادیب و شاعر کسی نہ کسی شکل میں فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ شاعری میں آرزو لکھنوی کے بعد مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی اور راجندر کرشن وغیرہ اگرچہ فلمی گیتوں کے معیار کو ادبی معیار کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے اور پریم دھون بھی تھے جن کے نغمے ان دنوں کافی

۵۰ روشنائی: سجاد ظہیر ص ۳۶۷

مقبول ہو رہے تھے لیکن مجموعی طور پر ڈی این مدھوک اور مہاکوی سنتوشی ایسے تک بندوں کا ہی دور دورہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری نہیں ہوگی کہ عہدِ طفولیت سے ہی ساحر کے دل میں دو تمنائیں تھیں پہلی سیاسی و سماجی اور اقتصادی آزادی کے حصول کی اور دوسری فلمی نغموں کے معیار کو اوپر اٹھانے اور ادب کی سطح تک لے آنے کی اور ان دونوں خواہشات کی تکمیل میں وہ عمر بھر سرگرداں رہے، اپنی شاعری کے ذریعہ بھی اور عملی طور پر بھی۔ کیفی اعظمی کے بیان سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے، رقم طراز ہیں:

> وہ (ساحر) پہلی بار جب بمبئی آئے تھے تو کارپوریشن کا الیکشن ہونے والا تھا۔۔۔۔۔ ساحر میرے ساتھ پولنگ اسٹیشن پر گئے۔۔۔۔۔ پولنگ اسٹیشن پر غنڈوں نے کانگریس کی آڑ لے کر اودھم مچا رکھا تھا۔ کمیونسٹ رضا کاروں پر پتھر پھینکنا، گالیاں دینا، مزدور ووٹروں پر طرح طرح کا دباؤ ڈالنا، ساحر یہ تماشہ خاموشی سے نہیں دیکھ سکے۔ فوراً کمیونسٹ رضا کاروں کی صف میں شامل ہو گئے اور شام کے ساڑھے چھے بجے تک نعرے لگاتے رہے، دوڑتے رہے، کام کرتے رہے۔ [۵۱]

غرض یہ کہ بمبئی قیام کے دوران ساحر نوجوانوں اور مزدوروں کے جلسوں میں شرکت بھی کرتے اور اپنی شاعری اور اپنی تقاریر کے ذریعہ انھیں

[۵۱] ساحر لدھیانوی : کیفی اعظمی ص ۱۸

بیدار کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ ساحر کی نظمیں میرے گیت تمھارے ہیں، لہو نذر دے رہی ہے حیات، آوازِ آدم اسی ہنگامی دور کی یادگار ہیں۔ اسی اثناء میں احمد آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی جس میں ساحر بھی شریک ہوئے اور اپنی نظم:

شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے

بڑی آن بان اور موثر انداز میں سنائی۔

اسی زمانے میں ساحر کے دوست حمید اختر، تحریکِ آزادی پر فلم بنا رہے تھے جس میں نغمہ نگار کی حیثیت سے ساحر کا انتخاب کیا، یہ ان کی پہلی فلم تھی اور ساحر ایسے مبتدی نغمہ نگار کو فلم میں شامل کرنا لوگوں کے لیے تعجب کی بات تھی[۵۲] لیکن حمید اختر جو ساحر کے ہم جماعت اور دیرینہ رفیق تھے اور وہ بھی ساحر کے اس بدحالی کے زمانے میں، کسی دوسرے کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتے تھے اس طرح فلم آزادی کی راہ پر کا پہلا نغمہ جاگ اٹھا ہندستان صدا بند ہوا۔

یہ ساحر کا عبوری دور تھا اور بے کاری کے اس دور میں انھوں نے پیدل نہ جانے کتنی آفسوں کے چکر لگائے اور مایوس ہوکر لوٹے۔ مایوسی اور بے کاری کے اس دور میں انھوں نے کرشن چندر کا ایک اسکرپٹ بھی نقل کیا تھا۔ مہندر ناتھ اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کرشن جی (کرشن چندر) سرائے کے باہر پروڈیوس اور ڈائرکٹ کر رہے تھے ...... ساحر ان دنوں

۵۲۔ شاہد لطیف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "ساحر صاحب! آپ کی شعری اور ادبی صلاحیتوں سے ہمیں انکار نہیں۔۔۔ تاہم آپ سے فلم کے گانے لکھوانا ایک بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے اگر آپ کے اقتصادی حالات خوش گوار نہیں ہیں تو آپ بلا تکلف ہمارے یہاں دو وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔" ساحر یادوں کے آئینے میں ص ۳۶
اب یہ اور بات ہے کہ انہی کی فلم سوسائٹی کے لیے ساحر نے گیت لکھے، چاہتے تو وہ بھی اسی طرح کا جواب دے سکتے تھے۔

بیکار تھا۔ کام کاج کی تلاش میں سرگرداں تھا۔
مجھے یاد ہے انہی دنوں ساحرؔ نے کرشن چندر کا ایک
اسکرپٹ کاپی کیا تھا اور اسے کاپی کرنے کا معاوضہ
۴۵ روپے ملا تھا۔ تلخیاں اور تاج محل کے مصنف
کو پیٹ بھرنے کے لیے نقل نویس بھی بننا پڑا۔ یہ ہے
ہمارے دیش کا المیہ۔ [۵۳]

واقعی یہ ہمارے دیش کا المیہ ہی ہے کہ کتنے ہی صاحبِ فکر و قلم کو گوناگوں مسائل اور معاشی پریشانیوں کے سبب آج اس دور میں بھی بادلِ نخواستہ اپنی مرضی کے خلاف دوسروں کے آگے جبہ سائی کرنی پڑتی ہے جیسا کہ ساحرؔ کے ساتھ ہوا کہ چلے تو تھے فلمی نغموں کے معیار کو بلند کرنے اور بننا پڑا نقل نویس۔ سورج سنیم نے واقعتاً خرا لگتی بات کہی ہے:

The first job he landed in
films was for a movie called DO RAHA.
But not as a song writer. He was
engaged to make fair copies of the
scenes written by dialogue writer
Krishen Chander. The music director
of the film was Anil Biswas and the
song writer Prem Dhawan. One of the
Sahir's poems from 'Talkhian' – Mohabbat
Tark ki mein ne – was included in the movie. [۵۴]

۵۳ ساحرؔ بحیثیت دوست اور شاعر: فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر ص ۸۰
۵۴ Film Fare, August 16-31, 1985 P. 78-79

ان بیانات سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ ساحر کی شعری صلاحیتوں اور فنکارانہ خوبیوں کے سبھی معترف تھے۔ شاہد لطیف کا اعتراف اور فلم دوراہا میں محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے کی شمولیت اس کا زندہ ثبوت ہے۔

انہی دنوں ساحر نے فلمی نغمہ نگاروں کو اپنے نغمے بیچے۔ اس کا ذکر مہندر ناتھ نے بھی کیا ہے اور کرشن ادیب نے بھی اور سورج سنیم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

For a mere pittance of
five rupees Sahir did ghost
writing for Prem Dhawan of songs
like Seene Mein Sulagte hain
Armaan (TARANA). [۵۵]

ساحر کی تگ و تاز اور جہد و جہد ابھی جاری ہی تھی کہ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم نے ملک کا شیرازہ بکھیر دیا اور فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ساحر بمبئی میں تھے اور ان کی والدہ لدھیانہ میں۔ ملک کے طول و عرض میں آزادی کا جشن منایا جا رہا تھا اور ہجرت کا سلسلہ بھی جاری تھا اور خوں ریزی اور قتل و غارت گری کا بازار بھی گرم تھا۔ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور سرزمین پنجاب میں خوں ریزی کا اثر کافی گہرا اور شدید تھا۔ جدھر نظر اٹھتی کشت و خون کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آتا تھا۔ اشتراکی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ادیبوں نے تقسیم کے فوراً بعد پیدا ہونے والی سماجی اور سیاسی

Film Fare, August 16-31, 1985 P 79 [۵۵]

صورتِ حال پر اپنے مضامین، ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ اور شاعروں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے وسیلہ سے اپنے ردعمل کا مظاہرہ کیا۔

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

مفاہمت

ساحر اپنی والدہ کے لیے بہت فکرمند تھے، جلتے ہوئے بام و در اور فسادات کا خونی منظر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، چنانچہ وہ بمبئی سے لدھیانہ جانے کے لیے دہلی آ گئے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی درد بھری آواز میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے قوم کے نام اپنا پیغام جاری کیا:

ساتھیو! میں نے برسوں تمھارے لیے
چاند تاروں بہاروں کے سپنے بنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا

ملک کی وادیاں کھائیاں کھیتیاں
عورتیں، بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو

ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو

آج

جب فسادات کا زور کم ہوا تو ساحر لاہور گئے۔ ان کی والدہ شورش کاشمیری کے گھر قیام پذیر تھیں۔ ادھر بمبئی جانے کی وجہ سے شاہکار اور ادبِ لطیف کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ چودھری نذیر احمد نے ۱۹۴۸ء میں دو ماہی سویرا کا اجرا کیا اور ادارت میں احمد ندیم قاسمی اور ساحر کو شامل کیا۔ "ساحر نے جان پہچان کالم کے تحت ادبی شخصیات کو متعارف کرانے کے لیے سویرا میں ایک کالم شروع کیا تھا جس میں شعراء و ادباء سے متعلق خصوصی نوٹ کے ساتھ ان کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں ۵۶"

لیکن سویرا چوں کہ ترقی پسندوں کا نمائندہ جریدہ تھا اس لیے حکومتِ پاکستان کے نظم و ضبط اور آئین کے مزاج کے خلاف تصور کیا جانے لگا۔ "لہٰذا ہر ترقی پسند شاعر اور ادیب پر حکومت کا عتاب نازل ہو رہا تھا۔ ظہیر کاشمیری اور حمید اختر کو گرفتار کر کے جیل بھیجا جا چکا تھا۔ ۵۷"

چنانچہ سویرا کے اداریے کے سبب حکومتِ پاکستان نے احمد ندیم قاسمی اور ساحر کے خلاف بھی گرفتاری وارنٹ جاری کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے لاہور کو خیرباد کہا اور جون ۱۹۴۹ء میں ہندستان چلے آئے۔ دہلی میں انھوں نے کم و بیش ایک سال قیام کیا اور اس ایک سال میں انھوں نے حالی پبلشنگ ہاؤس کے مالکان محمد یوسف جامعی اور بدرالحسن سے مل کر دو ماہی رسالہ شاہ راہ کا اجرا کیا اور ادارت میں اپنے ساتھ بحیثیت نائب مدیر پرکاش پنڈت کو بھی شامل کر لیا۔ "شاہراہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا اور سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اس میں لکھتے تھے۔ میرا ناول 'سیندور کی راکھ' بھی پہلی بار شاہراہ میں ہی چھپا تھا۔ ساحر سب دوستوں کی تخلیقات کو

۵۶ ماہی فکر و فن بمبئی مدیر قتیل راجستھانی جولائی تا جنوری ۱۹۹۴ء جلد ۵ شمارہ ۱۵ ص ۷
۵۷ ساحر یادوں کے آئینے میں : کرشن ادیب ص ۶۸

۵۸
بڑی محبت سے اور سجا سنوار کر چھاپتا تھا۔ ہندستان میں شاہراہ کو وہی اہمیت حاصل ہوئی جو پاکستان میں ادبِ لطیف، شاہکار اور سویرا کو حاصل تھی۔ شاہراہ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سردار گورو بخش سنگھ نے بھی اپنے رسالہ پریت لڑی کی ادارت ساحر کو سونپ دی لیکن ساحر جلد از جلد بمبئی پہنچنا چاہتے تھے چنانچہ وہ شاہراہ کے دو شمارے ہی نکال سکے اور مخمور سعیدی کے بیان کے مطابق ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی مشہور کانفرنس میں، جو بھیونڈی کے مقام پر ہوئی تھی اور اسی سے موسوم ہے، شرکت کے لیے گئے تو پھر دلّی واپس نہ آئے اور دوبارہ بمبئی کا رخ کیا۔ ۵۹ لیکن کرشن ادیب کے مطابق شاہراہ سے تعلق توڑنے کی وجہ محمد یوسف جامعی کی خسیس طبیعت اور تجارتی ذہنیت تھی، لکھتے ہیں:

> (محمد یوسف جامعی) کا جی پیشہ تو مچھلی کا بیوپار تھا اور وہ ادب کو بھی اسی قسم کا کاروبار سمجھتا تھا اس سے پیسے مانگتے وقت ساحر کو بہت ذلت کا احساس ہوتا تھا۔ پچاس مانگے دس ملے والی بات تھی۔ ۶۰

یہ بیان حقیقت سے قریب اس لیے بھی لگتا ہے کہ مچھلی کا کاروبار کرنے والا شخص ادب سے کس قدر رشتہ استوار کر سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ کرشن ادیب، ساحر کے قریبی دوستوں میں ہیں۔

غرض ان تمام صعوبتوں اور الجھنوں کے باعث والدہ کو پرکاش پنڈت کی نگہبانی میں چھوڑ کر ساحر بمبئی روانہ ہو گئے اور کرشن چندر کے

---

۵۸ تیسرے درجے کا مسافر: کشمیری لال ذاکر، مشمولہ فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۷
۵۹ ساحر لدھیانوی، ایک مطالعہ مرتب مخمور سعیدی ص ۱۴
۶۰ ساحر یادوں کے آئینے میں: کرشن ادیب ص ۳۵

یہاں ورسوا کور لاج کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہو گئے۔
انہی دنوں اے آر کاردار مشہور مکالمہ نویس اندر راج آنند کی کہانی پر فلم بنا رہے تھے جس کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے اور کسی اچھے نغمہ نگار کی تلاش میں تھے۔ ساحر، موہن سہگل کے ایما پر برمن سے ملے۔ برمن نے دھن سنائی اور گانے کی سچوایشن بتائی۔ ساحر نے وہیں بیٹھے بیٹھے گیت لکھا:

ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں
رت ہے جواں تم کو یہاں
کیسے بلائیں

اس طرح فلم نوجوان کا کنٹریکٹ ساحر کو مل گیا اور ان کا فلمی سفر بھی شروع ہو گیا۔ یہ گیت لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ ہوا جو آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس فلم کے گیتوں اور بالخصوص اس نغمہ کی کامیابی نے ساحر کو پہلی بار نغمہ نگار کی حیثیت دلادی اور پھر بازی کے گیتوں:

سنو گجر کیا گائے، سمے گزرتا جائے

اور

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگالے

کی بدولت ساحر صف اول کے نغمہ نگاروں کی فہرست میں آ گئے۔ اس کے بعد تو ساحر اور برمن کی جوڑی اس طرح چلی جیسے شنکر جے کشن اور شیلندر اور حسرت جے پوری کی جوڑی۔ اس کے بعد سے ساحر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اور جال (۱۹۵۲) ٹیکسی ڈرائیور (۱۹۵۴) ملیم جی (۱۹۵۵) فنٹوش (۱۹۵۶) نے ساحر کی شہرت و کامیابی میں چار چاند لگا دیے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ میں

گرو دت کی پیاسا بنی ۔ جوڑی وہی ساحرؔ اور برمن ۔ اس فلم کی زبردست کامیابی نے اس عہد کی تمام فلموں کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے نغموں نے عوام کے دلوں پر ساحرؔ کا سکہ جما دیا، لوگ ایس ڈی برمن کو بھول گئے ۔ بلکہ عام خیال تو یہ ہے کہ یہ فلم ساحرؔ کی سوانح حیات ہے اور جو لوگ ساحرؔ کی حیات سے متعلق معلومات رکھتے ہیں اس کی تصدیق بھی کریں گے ۔
ہارون رشید علیگ پیاسا سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ایک مختلف پیرایہ میں کرتے ہیں :

> فلم انڈسٹری میں آج تک صرف دو فلمیں ایسی بنائی گئی ہیں جن کی کامیابی کا کریڈٹ ان کے نغمہ نگاروں کو جاتا ہے ۔ ایک پیاسا اور دوسری ہیر رانجھا ہیر رانجھا میں کیفی ہی کیفی تھے ۔ دلکش نغمے اور منظوم ڈائیلاگ سب ان کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے ۔ پیاسا میں ہر چند کہ ساحرؔ نے مکالمے نہیں لکھے تھے لیکن پہلی بار ہندستانی فلم پر اس کا گیت کار پوری طرح غالب تھا ۔۔۔ 'جانے کیا تو نے کہی'، 'آج سجن موہے انگ لگا لو'، 'جانے وہ کیسے لوگ تھے'، 'سر جو ترا چکرائے'، 'جنھیں ناز ہے (تھا) ہند پر وہ کہاں ہیں' اور 'یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے' ۔۔۔۔ ہم نہیں سمجھتے کہ آج تک کسی شاعر نے پردۂ سیمیں کا سہارا لے کر سماج کا اتنا بڑا پوسٹ مارٹم کیا ہے ۔ ۱۵۵

اس فلم کے ذریعہ انھوں نے سماج کے ٹھیکیداروں اور سیاسی دلالوں کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے ۔ اس کا گیت 'جنھیں ناز تھا ہند پر وہ کہاں ہیں'

۱۵۵ وہ جو اک آفتاب ابھرا تھا مضمون مشمولہ فلمی ستارے دہلی ساحرؔ لدھیانوی نمبر جنوری ۸۱ء ص ۵۰

کی نمائش پر، حکومتِ ہند نے ابتدائی دنوں میں پابندی لگا دی تھی کیوں کہ اس میں چکلے کا منظر دکھایا گیا تھا اور اس مہذب معاشرہ میں سماجی حقیقتوں کو پیش کرنا اور گندگیوں کو بے نقاب کرنا اخلاقی جرم تھا اور اسمیں وہ پیر، جوان، تنومند بیٹے، اباجیاں سبھی بے نقاب ہوئے تھے[۶۲] ۔ چکلے کی یہی عورت آگے چل کر غلام عباس کے افسانہ آنندی میں اپنی کسمپرسی اور بےبسی کی داستان اور عورتوں کے دائمی تقدس کی پہچان بن کر ابھری ہے۔

اسقدر کامیابی اور شہرت کے باوجود، جب کہ ساحر کا سکہ چلنے لگا تھا وہ جس طرح کے گیت چاہتے لکھ سکتے تھے اور فلم ساز یا موسیقار معترض بھی نہ ہوتے لیکن انھوں نے 'اپنا میناڈیکا'، 'پیپل کے پیڑ تلے تم بھی ملو میں بھی ملوں'، 'گورے گورے او بانکے چھورے'، 'میرا بلبل سو رہا ہے'، 'پاپی جوبنا کا دیکھو ابھار او جانے والے بالموا' اور 'ایک تھی لیلی ایک تھا مجنوں

ہو گئی پھر دونوں میں لوں لوں ہو'

جیسے گیت لکھ کر ڈی این مدھوک کی طرح کبھی بھی بینک بیلنس بنانے اور نئے نغمہ نگاروں کو چک بک دکھانے کی کوشش نہیں کی اور[۶۴] ایسے مبتذل گیتوں کی نہ صرف مذمت کی بلکہ اس سے گریز بھی کیا اور دوسرے نغمہ نگاروں کو ادبی گیت لکھنے کا حوصلہ بھی دیا۔ البتہ ساحر نے اتنا ضرور کیا جیسا کہ ظ انصاری نے بھی لکھا ہے[۶۳]، خالص ادبی نظموں کو، جو ادبی حلقوں میں قبول عام کی سند حاصل کر چکی تھیں ایک درجہ نیچے اتارا اور 'ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں' کی جگہ 'جنہیں ناز تھا ہند پر وہ کہاں ہیں' کی سطح تک لے آئے۔ ساحر کے یہ نغمے اسی طرح مقبول ہوئے اور اور اسی بلندی پر پہنچے جہاں تلخیاں کی دوسری نظمیں جگہ بنا چکی تھیں۔ اس ضمن میں

۶۲ وہ جو اک آفتاب ابھرا تھا مضمون شمولہ فلمی ستارے دہلی ص ۵۰

۶۳ تفصیل کے لیے مضمون 'ساحر کی یاد میں' مشمولہ فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

۶۴ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ساحر یادوں کے آئینے میں: کرشن ادیب ص ۳۳-۳۲

ابراہیم جلیس نے اپنے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

ساحر اور مجروح جیسے شاعروں سے پہلے
فلمی دنیا میں اس بات کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ٹھیٹ ادبی
نظمیں فلموں میں بھی جگہ پاسکیں لیکن آج سارے ہندوستان
میں ساحر کی مشہور ادبی نظم چکلے فلم کے ذریعے گونج
رہی ہے۔[۶۴]

فلم انڈسٹری کے تمام نغمہ نگاروں میں یہ اعزار صرف ساحر کو حاصل ہے کہ نہ صرف ان کے مجموعۂ کلام کا ہی انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے[۶۵] بلکہ ان کے متعدد فلمی نغمے انگریزی میں ترجمہ ہوکر ساری دنیا میں مشہور ہوئے۔ یہی نہیں فلم پیاسا بھی انگریزی میں ڈب ہوکر عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے اس کے گیتوں کا انگریزی ترجمہ ستیش بھٹناگر نے کیا تھا، خود انہی کے الفاظ میں:

گرودت جی نے ... تمام گیتوں کے انگریزی
ترجمے مجھ سے کرائے تھے ... اس فلم کے تمام انگریزی
گیت ساری دنیا میں مشہور ہیں خاص طور سے
امریکہ وغیرہ میں ان کے (ساحر کے) ان گیتوں کو کافی
سراہا گیا اور روس تو پہلے ہی سے اس ساحر شاعر
کا شکر گزار رہا ہے۔[۶۶]

ان گیتوں کی بے پایاں مقبولیت نے نہ صرف ان کی ترقی کے راستے کھول دیے بلکہ وہ بلند مقام عطا کر دیا کہ فلمساز خود چل کر ان کے گھر آنے لگے۔ فلموں میں آنے کے بعد اگرچہ ان کا تخلیقی کام قدرے رک سا گیا لیکن انھوں نے

---

۶۴ شب کی مملکت میں دن کا سفیر: نگار، کراچی فروری ۱۹۵۹ء بحوالہ ساحر لدھیانوی - ایک مطالعہ ص ۶۸

۶۵ یہ ترجمہ خواجہ احمد عباس نے کیا تھا، تفصیل کے لیے فلمی ستارے ساحر نمبر سے رجوع کیا جاسکتا ہے

۶۶ فلمی ستارے دہلی: مدیر انیس دہلوی، ساحر لدھیانوی نمبر جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۴

اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ فلمی نغموں کو ہی اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنالیا اور اپنی بعض نظموں اور غزلوں کو جیسا کہ سابقہ صفحات میں عرض کیا گیا، یا تو ویسے ہی یا پھر تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد فلموں میں پیش کر دیا مثلاً

'محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے' غزل

'میں پل دو پل کا شاعر ہوں'

'پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ' فرد

'تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم' غزل

'جنھیں ناز تھا ہند پر وہ کہاں ہیں' چکلے

'میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے' تاج محل

'میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے' فن کار ۶۷

'کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے' کبھی کبھی

'کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرا جائیں' ہرا س

'اے رہبرِ ملک و قوم ذرا، آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا' یہ کس کا لہو ہے؟

'میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی' متاعِ غیر

'چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے' انتظار

'چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں' خوبصورت موڑ

'تیرا ملنا خوشی کی بات سہی' ردِ عمل ۶۸

'دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے' غزل

حالانکہ ساحر کو ہمیشہ اس طرح کے مواقع میسر نہیں آئے کہ اپنے خیالات اور نظریات کو فلمی گیتوں میں پیش کر سکیں اور اپنے من پسند گیت لکھ سکیں اور نئی نسلوں کے

۶۷ یہ نظم پاکستانی فلم سہولہ آنے میں (ساحر کی اجازت سے) شامل ہے جو ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوئی

۶۸ ردِ عمل نظم کے آخری دو مصرعے فلم سولھواں سال میں شامل ہیں جب کہ اس فلم کے نغمہ نگار مجروح سلطانپوری ہیں۔

جذبات و احساسات اور حالات و ماحول سے متعلق ان کے شکوک و شبہات کو گیتوں میں پیش کر سکیں لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ موقع ملا ہے تو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیا ہے اور بسا اوقات اپنے نظریات کا کھلے بندوں اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً

'زندگی صرف محبت نہیں کچھ اور بھی ہے
زلف و رخسار کی جنت نہیں کچھ اور بھی ہے
بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی اس دنیا میں
عشق ہی ایک حقیقت نہیں کچھ اور بھی ہے' ۴۵

'محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے'
'محبت کر تو لیں لیکن محبت راس آئے گی
دلوں کو بوجھ لگتے ہیں کبھی زلفوں کے سائے بھی
ہزاروں غم ہیں اس دنیا میں اپنے بھی پرائے بھی
محبت ہی کا غم تنہا نہیں ہم کیا کریں' ۴۶

'جن کے ظلم سے دکھی ہے جنتا ہر بستی ہر گاؤں میں
دیا دھرم کی بات کریں وہ بیٹھ کے بھری سبھاؤں میں
دان کا چرچا گھر گھر پہنچے لوٹ کی دولت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے اصلی صورت چھپی رہے' ۴۷

'نہ جانے کب یہ طریقہ یہ طور بدلے گا
ستم کا، غم کا، مصیبت کا دور بدلے گا' ۴۸

'ایک چہرے پہ کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ' ۴۹

'تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا' ۵۰

'وہ صبح کبھی تو آئے گی' ۵۱

'خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟' ۵۲

'یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا' ۵۳

'بانٹ کے کھاؤ اس دنیا میں بانٹ کے بوجھ اٹھاؤ
جس رستے میں سب کا سکھ ہو وہ رستہ اپناؤ' مو
'سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے' مو
'تورا من درپن کہلائے' مو
'عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا' مو

ایسے صدہا گیت ہیں جو نہ صرف ساحر کے نظریات و خیالات کے ترجمان ہیں بلکہ حالات و حیات کے گوناگوں مسائل اور ہندستان کی تہذیبی زندگی کے عکاس بھی ہیں۔

ساحر کی زندگی میں اصولوں کو بڑی اہمیت رہی ہے، فلم انڈسٹری میں بھی اور ذاتی زندگی میں بھی، اور جن پر وہ تادم آخر قائم بھی رہے۔ اسی لیے انھوں نے سربلندوں کے سامنے سر نہیں جھکایا لیکن خاکساروں کے ساتھ ہمیشہ انکساری کا رویہ رکھا۔ فلم پیاسا کے بعد ساحر اور برمن ایک ساتھ کبھی نہیں آئے اور یہ کامیاب جوڑی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی اور وجہ وہی خودداری اور انا کا مسئلہ۔ کیوں کہ برمن کا اصرار کہ موسیقی کی بدولت ہی گیت کامیاب ہوتے ہیں اور ساحر کا یہ استدلال کہ اچھی شاعری کو سکہ بند موسیقار کی ضرورت نہیں اور ہارون رشید علیگ کا بیان ہے کہ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت چند سطحی حضرات یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ اب ساحر کی جادوگری ختم ہوئی لیکن ساحر کے گیت کسی خاص موسیقار کے محتاج نہ تھے۔ ۶۹

اس کے بعد ساحر نے کسی سکہ بند موسیقار کے لیے گیت نہیں لکھا اور وہ موسیقار جو کم معروف بھی تھے اور تجارتی لحاظ سے چھوٹے بھی، ساحر کے

۶۹ فلمی ستارے دہلی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۰

نغموں کی بدولت نہ صرف شہرت ہی حاصل کر سکے بلکہ کامیابی سے ہم کنار بھی ہوئے۔ مثلاً روشن، این دتہ، مدن موہن، روی، خیام اور کلشمی پیارے جے دیو وغیرہ۔ ان میں جے دیو اور خیام جو تقریباً گم نام ہو چلے تھے ساحر کے سبب ہی منظرِ عام پر آئے اور فلم انڈسٹری پر چھا گئے۔

جے دیو ساحر کے ساتھ پہلی بار ہم دونوں میں آئے اور اللہ تیرو نام اور کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا جیسے گیتوں کے ساتھ اٹھے اور تیرے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں اور اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے (مجھے جینے دو) سے زندۂ جاوید ہو گئے۔ خیام نے ساحر کے ساتھ ہر چند کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی (پھر صبح ہوگی) اور پربتوں کے پیڑوں پر اور تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو (شگون) تک رہے لیکن اس کے بعد گمنامی کے اندھیرے میں ڈوب گئے بعد ازاں لیش چوپڑہ کی فلم کبھی کبھی میں صرف ساحر کے سبب موقع پا سکے اور کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے کے ذریعہ عوام پر چھا گئے۔
خواجہ احمد عباس اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے، کہتے ہیں:

> وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی فلمی شاعری میں ایک خالص ادبی معیار قائم رکھا بلکہ شاعروں کا رتبہ بھی فلم انڈسٹری میں بڑھایا۔ ان کا یہ اصرار کہ میں بڑے میوزک ڈائرکٹروں اور پلے بیک سنگروں کے ساتھ گانے نہیں تخلیق کروں گا، یہ کوئی ذاتی تعلی نہ تھی۔ یہ ان کی شاعرانہ اور ادبی خود اعتمادی تھی کہ میں گانے کو اپنے مواد اور شاعری کے ذریعہ کامیاب بنا سکتا ہوں۔ اس لیے وہ تجارتی لحاظ سے "چھوٹے" (مگر قابل) میوزک ڈائرکٹروں کے ساتھ بہت خوشی کے ساتھ کام کرتے تھے ۵۷

۵۷ ساحر جو پہلے سے تنہا ہو گیا۔ مضمون مشمولہ بیسویں صدی دہلی دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۱

بعینہ یہی صورت ساحر اور لتا منگیشکر کے مابین اختلاف کی ہوئی کہ کسی فلم ساز نے ساحر سے کہہ دیا کہ لتا منگیشکر کی آواز کی بدولت ہی آپ کے نغموں میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ ساحر کی خودداری، اس بات کو تسلیم کر لینے میں یہاں بھی مانع آئی اور پھر کئی برسوں تک نو آموز گلوکارائیں ساحر کے نغمے گاتی رہیں اور سدھا ملہوترہ اور جگجیت کور کے گائے ہوئے ساحر کے نغموں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ اولیت بہرحال شاعری کو ہی حاصل ہے۔ آواز اور موسیقی اضافی چیزیں ہیں اور ان سے گیت کے حسن میں اضافہ ہو سکتا ہے ورنہ

سلام حسرت قبول کر لو مری محبت قبول کر لو

اور

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو

لتا منگیشکر کی آواز کے بغیر بھی مشہور ہوئے اور خوب چلے، گو بعد میں ساحر اور لتا میں مفاہمت ہو گئی اور یہ مفاہمت قربت میں تبدیل ہو گئی ساحر کی نظم تیری آواز اسی قربت کی عکاس ہے۔ یہ نظم دہلی سے نکلنے والے رسالے فنکار میں شائع ہوئی تھی جس کے مدیر پرکاش پنڈت تھے اور اس نظم کا انتساب لتا منگیشکر کے نام تھا۔ بعد میں یہ نظم تیری آواز کے عنوان سے تلخیاں میں شامل ہوئی۔ یہ عشق کا یک طرفہ تعلق نہیں تھا بلکہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی' والا معاملہ تھا۔ ساحر کی ایک دوسری نظم انتظار بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ پھر ایک زمانے میں سدھا ملہوترہ کا نام بھی ساحر سے منسوب رہ چکا ہے اور مخمور سعیدی کے مطابق سدھا ملہوترہ اور ساحر کا عشق اخباری سرخیوں کی بھی زینت بنا اور ادبی اور فلمی حلقوں میں مہینوں تک اس کے چرچے رہے۔[۱۷] ساحر کا یہ معاشقہ بھی ناکامی پر منتج ہوا اور وہ

[۱۷] ساحر لدھیانوی۔ ایک مطالعہ ص ۲۸

ایک بار پھر زندگی کی اس بھیڑ میں اجنبی کی طرح یک و تنہا رہ گئے اور شکست خوردگی کا شدید احساس غالب آیا۔ خوبصورت موڑ اسی احساسِ شکست کا غماز ہے۔

بیسویں صدی کے پانچویں دہے میں ساحر نے نہ صرف فلمی گیتوں کو ادبی معیار تک پہنچایا اور فلموں کو خالص تک بندوں سے نجات دلائی بلکہ عوام کو اور فلمی و غیر فلمی ہستیوں کو شاعروں کی عظمت کا احساس بھی دلایا۔ ذاتی مفاد کی پرواہ کیے بغیر اجتماعی زندگی کی خوش حالی کی خاطر انھوں نے ہر ظلم اور زیادتی اور بے توجہی اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی۔

ساحر سے قبل فلم کے پوسٹروں پر شاعر یا نغمہ نگار کا نام نہیں لکھا جاتا تھا۔ ساحر نے اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا حالانکہ ساحر سے قبل مجروح سلطانپوری بھی تھے اور شکیل بدایونی بھی، جاں نثار اختر بھی تھے اور راجندر کرشن بھی اور پریم دھون، ڈی این مدھوک اور پی ایل سنتوشی بھی، لیکن سبھی نے اس حق تلفی کے خلاف احتجاج کرنے سے گریز کیا۔ ساحر نے اس مروجہ اصول کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا۔ یہی حال محکمۂ اطلاعات و نشریات کا تھا۔ ریڈیو پر گانا بجتا تھا لیکن محض موسیقار کے نام کے ساتھ۔ یہاں بھی نغمہ نگار غیر اہم اور بے حقیقت تھا لیکن حکومت کے سامنے احتجاج کرنے یا اپنی بات رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد چاہیے تھی اور ساحر کے ابتدائی ایام میں ٹھوس بنیاد تو دور فلموں میں پاؤں رکھنے تک کو جگہ نہ تھی تاہم اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے اور اس بندش کو توڑنے کا عہد انھوں نے اسی وقت کر لیا تھا اور ۱۹۵۹ء میں ساحر جب فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے نائب صدر منتخب ہوئے تو انھیں ٹھوس بنیاد مل چکی تھی۔ خواجہ احمد عباس، جو ایسوسی ایشن کے صدر تھے، شاعروں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر، ساحر کی انتھک کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

جب فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا اس کو (ساحر کو) وائس پریسیڈنٹ چنا گیا ... تو اس نے شرط رکھی کہ ہم دونوں مل کر شاعروں کو ان کا حق دلوانے کی جدوجہد کریں گے۔ سب سے پہلے اس جدوجہد کے لیے ہم نے ریڈیو کا میدان چنا۔ ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل سے میں اور ساحر ملنے کے لیے دہلی گئے۔ وہاں جاکر ان سے کہا کہ آپ ہر گانے کے ساتھ اس کے پلے بیک سنگر کا نام اناؤنس کرتے ہیں، میوزک ڈائرکٹر کا نام اناؤنس ہوتا ہے لیکن شاعر کو ہی کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے، وہ بولے کہ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس وقت کم ہوتا ہے اس لیے شاعر کا نام نہیں دے سکتے۔ اس پر ساحر نے ان سے کہا کہ ہر ریکارڈ کے ساتھ فرمائش کرنے والوں کے نام کئی منٹ تک سنائے جاتے ہیں تو اس میں وقت ضائع نہیں ہوتا؟ یہاں پر ڈائرکٹر جنرل بھی قائل ہو گئے اور چند روز بعد انھوں نے ہدایت دے دی کہ ہر گیت کے ساتھ اس کے شاعر کا نام بھی براڈ کاسٹ ہونا چاہیے۔[۵۷۲]

فلموں کو اور بالخصوص فلمی شاعروں کو ساحر کی یہ بہت بڑی دین ہے کہ انھوں نے بے توجہی اور ناانصافی کے شکار نغمہ نگاروں کو ان کا جائز حق دلایا اور فلم سازوں، موسیقاروں اور حکومت کے عہدہ داروں میں فلمی شاعری اور فلمی شاعروں کا مرتبہ بلند کیا۔

۵۷۲ وہ ادھار باقی رہ گیا، مضمون مشمولہ فن اور شخصیت ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۵۱

اگلے سال (۱۹۶۰) میں ساحر کو ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ ساحر کے ساتھ مہندر ناتھ جنرل سکریٹری ہوئے۔ حالانکہ اب ترقی پسند تحریک کا پہلا سا زمانہ نہیں تھا اور نہ کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت باقی رہی تھی۔ سیاست پر سے لوگوں کا اعتبار بھی اٹھنے لگا تھا اور کہنے کو تو ملک آزاد ہو چکا تھا اور جمہوری نظام بھی قائم ہو گیا تھا لیکن سماجی اور تہذیبی زندگی پہلے سے بھی بدتر ہو چکی تھی اور غربت و افلاس میں بھی حد درجہ اضافہ ہوا تھا۔ محنت کشوں کی زندگی اور بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی لیکن انسانوں کی بھیڑ میں کون کس کی بات سنتا۔ انقلاب آفریں نغمات بکھیرنے والے لوگ، شاعر اور ادیب اختر الایمان کی نظم ایک لڑکا کے کردار کی طرح شہری زندگی کے ہنگاموں میں کھو گئے تھے چند ایک رہ گئے تھے جن کے دل ابھی زندہ تھے اور جنھیں اجتماعی زندگی کے غم و آلام کا احساس تھا۔ ساحر انہی زندہ دل لوگوں میں سے ایک تھے۔ انسان دوستی اور دوست نوازی کے نظریے پر کاربند۔ دوستوں کے ہم درد اور نا آشناؤں کے غم گسار۔ اور ان کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا حتی المقدور کیا۔ گڑوا نامی ساز[۷۳] کے حوالے سے کرشن ادیب نے جو واقعہ نقل کیا ہے وہ ساحر کے اسی خلوص اور غم گساری کا مظہر ہے۔ نیز اپنے دیرینہ دوست رام پرکاش اشک کے کینسر کے علاج کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا اس کی مثال شاذ و نادر ہی مل سکتی ہے بلکہ "یہ مثال فلمی دنیا میں پہلی ہے اور شاید آخری بھی"[۷۴]

ساحر بلا شبہ ایک دکھی انسان تھے۔ حیات و حالات کے گوناگوں مسائل، زمانہ کی چیرہ دستیاں اور طبقاتی تضاد ان پر ہمیشہ حاوی رہے، یہی وجہ تھی کہ دوسروں کا دکھ دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے تھے چنانچہ کسی بھی طرح کی ناانصافی

۷۳۔ تفصیل کے لیے ساحر یادوں کے آئینے میں، سے رجوع کیا جا سکتا ہے

۷۴۔ انارکلی سے پرچھائیاں تک: سی ایل کاوش، مضمون مشمولہ فن اور شخصیت ص ۱۱۷

اور ظلم و زیادتی برداشت نہیں کر پاتے تھے اور چیخ اٹھتے تھے۔ اور اس طرح وہ ہمیشہ عوام کے خدمت گار بن کر رہے اور ذاتی مفاد کی خاطر کبھی بھی اپنے منصب کو استعمال نہیں بلکہ اس کا فائدہ ہمیشہ دوسروں کو پہنچایا۔[۷۵] ۱۹۵۹ء کے بعد سے وہ مستقل فلم رائٹرز ایسوسی ایشن اور فلم ورکرز ایسوسی ایشن سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ رہے۔ کبھی نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے اور کبھی خصوصی نمائندے اور اہم رکن کی صورت میں۔

اس اثنا میں جیسا کہ عرض کیا گیا، فلمی زندگی کی مصروفیات کے سبب ادبی شاعری کی طرف مراجعت کے مواقع کم ہی میسر آئے لیکن اس کا بھی انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے ہم عصروں کے برخلاف نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں نیز قومی یا بین الاقوامی سطح پر کوئی بھی ناقابل فراموش حادثہ پیش آیا ان کی فکر کا حصہ ضرور بنا۔ ۱۹۴۶ء میں آزادی کی خاطر جہازیوں کی بغاوت کے اثرات یہ کس کا لہو ہے؟ میں نمایاں ہیں۔

ساحر نے دوسری جنگ عظیم کے ستم جھیلے تھے اور جنگ سے پیدا شدہ تباہیوں اور قیامت خیزیوں کو محسوس کیا تھا اور اب ایک بار پھر دنیا کے چند عظیم ممالک پوری انسانیت کی تباہی کا جال بن رہے ہیں اور ایٹمی جنگ کی تیاریوں کے آثار نمایاں ہیں اس کے خلاف عالمی سطح پر امن تحریک چلائی گئی چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ساحر نے امن عالم کے موضوع پر اپنی ۱۸۴ مصرعوں پر مشتمل شاہکار طویل نظم پرچھائیاں لکھی۔ یہ نظم سب سے پہلے چٹان لاہور میں شائع ہوئی۔[۷۶] ساحر انسانوں کو انسان کی شکل میں دیکھنے کے قائل تھے مذہبی خانوں میں بانٹ کر دیکھنا ان کے نظریے کے خلاف تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ امن کی بحالی کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی ان کی نظم

[۷۵] فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے فنکشن اور سوونیر والا معاملہ اس کا کھلا ثبوت ہے تفصیل کے لیے فن اور شخصیت مہندر ناتھ یادگار نمبر سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

[۷۶] اس کے مدیر شورش کاشمیری تھے۔

اے شریف انسانو! جنگ کے بھیانک انجام سے نجات حاصل کرنے کی راہ دکھاتی ہے۔ اسی طرح خون پھر خون ہے اپنے موضوع اور تاثیر کے لحاظ سے انفرادی نظم بن گئی ہے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کا صد سالہ جشن حکومت ہند کے ایما پر منایا گیا اور اردو زبان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے وہی اردو جس کو تقسیم ملک کے بعد دیس نکالا مل چکا تھا دوسری طرف سنسر نے اردو فلموں پر بھی ہندی کا لیبل لگایا تو ساحر خاموش نہ رہ سکے اور ہم عصر وزیر تعلیم کی موجودگی میں ہندی کی بالادستی کے خلاف حکومت کی چالبازیوں کو بے نقاب کیا۔ نظم جشن غالب اسی احتجاج کی ترجمانی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ منافرت بڑھنے لگی جس نے ۱۹۶۹ء میں بدترین فساد کی صورت اختیار کرلی مئو ناتھ بھنجن، بڑودہ، احمد آباد اور نہ جانے کتنے شہر اور قصبے اس فرقہ پرستی کی نذر ہو گئے۔ آزاد ہندستان پہلی بار کرفیو سے دوچار ہوا۔ اسی سال گاندھی شتابدی اور غالب صدی بھی منائی جارہی تھی۔ اہنسا کے پجاری گاندھی کی سرزمین ہی نفرت وکشیدگی اور خوں ریزی کا مسکن بنا ہوا تھا۔ نظم گاندھی ہو یا غالب ہو اسی جھنجلاہٹ اور برسر اقتدار جماعت پر شدید طنز کی ترجمانی ہے۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ (ساحر کی پرانی درسگاہ) کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ عہدیداران نے اپنے دو پرانے طلبہ کی علمی و ادبی اور فنی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈل دینے کا فیصلہ کیا۔ فن (آرٹ) سے متعلق ایوارڈ سے مہر کشن لال آرٹسٹ اور ادبی ایوارڈ سے ساحر لدھیانوی کو سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر ساحر نے اپنی تازہ ترین نظم اے نئی نسل! طلبہ اور اساتذہ کے اجتماع میں پڑھی۔

ان کے علاوہ ساحر کی نظمیں میں زندہ ہوں، دیکھا ہے زندگی کو دل ابھی، آؤ کہ کوئی خواب بنیں، نادار تک نہیں پہنچا، جواہر لال نہرو لینن ۱۹۱۷ء اور لینن ۱۹۷۰ء، چھبیس جنوری ایسی نظمیں ہیں جو دوسرے مجموعۂ کلام آؤ کہ کوئی خواب بنیں میں شامل ہیں۔ لیکن ساحر کی غیر مطبوعہ نظموں اور غزلوں کی تعداد بھی بہت ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے۔ ۱۹۷۱ء میں آؤ کہ کوئی خواب بنیں کی اشاعت کے بعد کی تمام نظمیں اور غزلیں کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں اور کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جو مذکورہ مجموعہ کی اشاعت سے قبل لکھی گئیں یہ نظمیں بھی زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکیں۔

آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو مسیح پاک روح تھے

کرشن پھر آئیں گے پیار کا تحفہ اک دیا اور بجھا مرگھٹ کی سرزمین

آزاد وطن دیکھ ذرا اور میں ہر اک پل کا شاعر ہوں۔ یہ تمام نظمیں کسی مجموعہ میں نہیں ہیں لیکن صابر دت اور سرور شفیع نے فن اور شخصیت بمبئی کے ساحر لدھیانوی نمبر میں اثاثہ کالم کے تحت شائع کیا۔ اسی طرح ساحر کی ایک اور غیر مطبوعہ نظم ماں انور سلطانہ کے شکریہ کے ساتھ قتیل راجستھانی نے اپنے رسالہ فکر و فن سہ ماہی بمبئی سے شائع کی یہ نظم موجودہ ہندستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ منافرت کی عکاسی بھی کرتی ہے اور سیاسی لیڈروں کو آئینہ بھی دکھاتی ہے۔

ان کے علاوہ، جیسا کہ ساحر نے خود ذکر کیا ہے کہ شروع شروع میں کچھ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں اور بعد میں چند تنقیدی مضامین بھی۔[۷۷] لیکن افسوس کہ ساحر کے افسانے دستیاب نہ ہو سکے اور دو/۲ مضامین ترقی پسند ستیارتھی[۷۸] اور مہیندر ناتھ[۷۹] کے علاوہ دوسرے مضامین

[۷۷] فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۵۵

[۷۸] آج کل، نئی دہلی دیوندر ستیارتھی نمبر ص ۱۸

[۷۹] فن اور شخصیت بمبئی، مہیندر ناتھ یادگار نمبر ص ۳۹۹

بھی ہم دست نہ ہو سکے ورنہ ساحر کے ادبی کارناموں کا ایک اور گوشہ سامنے آجاتا۔ ادھر ایک اشتہار کے ذریعہ یہ انکشاف ہوا ہے کہ صابر دت ساحر کی نثری تخلیقات مرتب کر رہے ہیں اس سے یقیناً ساحر پر تحقیق کی نئی جہت سامنے آئے گی۔

۱۹۷۰ء کے بعد ساحر کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اعلیٰ اور اہم ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا۔ ۱۹۷۱ء میں اس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند وی وی گری نے چندم شری کا اعزازی خطاب عطا کیا۔ ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر حکومت نے نہ صرف "Justice of the Peace" کا خطاب دیا بلکہ اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ اور اردو اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا۔ ۱۹۷۳ء میں آؤ کہ کوئی خواب بنیں کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۴ء میں حکومت مہاراشٹر نے دوبارہ، ساحر کے جذبۂ ایثار، فکری و عملی صلاحیتوں اور عوام اور اپنے کام کے تئیں اخلاص و ہمدردی کے رویہ کے طفیل انھیں Special Executive Magistrate مقرر کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ساحر کا تخلیق کردہ فوجی ترانہ Army Service Corps کی ریکارڈنگ مہندر کپور کی آواز میں ہوئی اور اسی سال سول لائن لدھیانہ کی ایک سڑک کا نام ساحر کے نام SAHIR ROAD رکھا گیا۔ اسی سال امریکی محقق کارلو کوپالا Carlo Kopala نے اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے عنوان سے تحقیقی کام پورا کیا جس پر شکاگو یونیورسٹی نے انھیں Ph.D. کی ڈگری تفویض کی۔ اس مقالہ میں ہندو پاک کے پانچ اہم ترقی پسند شعراء میں ساحر کو بھی شامل کیا تھا اور ستمبر ۱۹۷۷ء میں صوبۂ پنجاب کا اعلیٰ ترین ایوارڈ اور اعزاز ساحر کے اعلیٰ ادبی کارناموں کے اعتراف

میں گولڈ میڈل کے علاوہ نقد رقم، ابھینندن گرنتھ اور شال کی شکل میں دیا گیا۔ لیکن ۱۹۷۶ء میں والدہ کی وفات نے ساحر کا سرمایۂ حیات ہی چھین لیا اور ان کے لیے زندگی کے معنی ہی ختم ہو گئے اسی لیے انھوں نے فلم چھوڑنے کا فیصلہ بھی کر لیا لیکن :

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

کے مصداق ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو خود دنیا سے رخصت ہو گئے۔
لیکن ساحر سماجی برائیوں کو ختم کرنے کا جو عزم لے کر چلے تھے۔ اخیر زمانے تک اسی راہ پر چلتے رہے۔ ان کی شاعری کا مرکز عوام رہے، محنت کش عوام، دبے کچلے، افسردہ، نڈھال اور زمانے کے ظلم و ستم سے بے حال، انہی کی خوش حالی کے لیے، غیر طبقاتی سماج کے قیام کی خاطر اور امن کے قیام اور اس کی بحالی کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ کچھ یہی صورت عورتوں کی کسمپرسی اور اس کی بے چارگی کے سلسلے میں رہی۔ وہ جانتے تھے کہ عورتوں کے ساتھ مردوں کا سلوک نہ صرف بے رحمانہ ہے بلکہ وحشیانہ بھی ہے اور چوں کہ وہ خود والدین کے مابین اختلافات و کشیدگی کے عینی شاہد تھے اس لیے ان کے جذبہ و احساس پر ان کے اثرات مرتب ہونا فطری عمل تھا۔ ساحر اپنی متعدد نظموں اور فلمی نغموں کے ذریعہ اس ظالمانہ رویے کے خلاف شدید غم و غصہ کا اظہار کر چکے ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں (انتقال کے صرف ایک ماہ قبل) فلم انصاف کا ترازو میں عورتوں کے داغ دار تقدس کے ذمہ دار سماج کے ٹھیکیداروں اور تہذیب کے علم برداروں کے چہروں کو بے نقاب بھی کیا ہے اور حکومت اور امارت کے تشدد پر زبردست حملہ بھی کیا ہے۔
غرضیکہ یہی معاملات و مسائل اور حادثات و واقعات ساحر کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں جنھوں نے ساحر کی شعری و ادبی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔